کچھ یادیں کچھ باتیں

[بیسویں صدی کے ہندستان کے چند مناظر]

محمد مسلمؒ

ترتیب و پیش کش

اطہر مسلم

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

دعوت اسلامی کارِ نبوت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک اسلامی نے بھی اسے اپنا مقصد بنایا ہے۔ ہندستان میں تحریک کے ترجمان کے طور پر دعوت اخبار نے ۱۹۵۳ سے دعوت اسلامی کے فروغ میں جو اہم کردار نبھایا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اتنا ہی نہیں اس کا ملک میں تعمیری اور معروضی صحافت کے استحکام میں بھی اہم کردار رہا ہے۔ ۶۲ سالہ حیات میں دعوت اخبار متعدد نشیب وفراز سے گزرا ہے مگر اس کے باوجود یہ اپنے آب وتاب کے ساتھ زندہ رہا۔

اس کی ابتدا ہفتہ وار سے ہوئی پھر سہ روزہ بنا۔ اس کے بعد روزنامہ ہوا، اس طرح کہ سہ روزہ بھی جاری رہا۔ بعد ازاں اسی کے ساتھ رنگین ہفتہ وار بھی وجود میں آیا۔ باقی سبھی نامساعد حالات کا شکار ہوکر بند ہوگئے مگر اب بھی سہ روزہ دعوت اپنے معیار کو بلند کرتا ہوا شائع ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سنجیدہ اور اہلِ علم طبقے میں قدر ومنزلت سے پڑھا جاتا ہے۔ ملک کی دیگر زبانوں کے اخبارات میں اس کی رائے کو وزن دیا جاتا ہے اور اس کے مضامین دیگر اخبارات وجرائد میں بڑے پیمانے پر نقل کیے جاتے ہیں۔ اب تو اس کا آن لائن اڈیشن بھی دست یاب ہے۔ اس کا بے حد مقبول کالم 'خبر ونظر' اور اداریوں کے ساتھ دیگر منتخب مضامین انگریزی میں بھی ترجمہ ہوکر ویب سائٹ پر بڑے شوق اور اشتیاق سے دیکھے اور پڑھے جاتے ہیں۔ دعوت کی تحریریں بعض علاقائی زبانوں میں بھی ترجمہ ہوکر شائع ہوتی ہیں۔ اس اخبار نے بامقصد اور معیاری صحافت کو فروغ دینے کے ساتھ بامقصد صحافیوں اور قلم کاروں کی چھے دہائیوں سے زائد عرصہ میں ایک بڑی تعداد بھی پیدا کی ہے۔ اسے فخر ہے کہ اس کی آبیاری

اصغر علی عابدی، محمد مسلم، محفوظ الرحمان اور سلمان ندوی نے کی ہے اور پرواز رحمانی کی سرپرستی میں یہ ہنوز ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔

محمد مسلم صاحب کا زمانۂ ادارت سہ روزہ دعوت کی زندگی میں بڑا ہی یادگار رہا ہے۔ انھوں نے بے شمار 'خبر و نظر' اور اداریوں کے ساتھ دیگر مضامین لکھے۔ مختلف ایشوز پر یہ سب اب بھی موزوں اور بروقت ہیں۔ اسی کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہفتہ وار دعوت میں ان کے تحریر کردہ 'کچھ یادیں کچھ باتیں' کے چند نمونوں کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔ توقع ہے کہ یہ نئی نسل کے لیے مفید اور کارگر ثابت ہوگا۔ محمد مسلم مرحوم کی دیگر تحریروں کی کتابی شکل میں اشاعت بھی پیش نظر ہے۔

محمد احمد
سکریٹری جماعت اسلامی ہند

پیش لفظ

بات تقریباً ۲۷ برس قبل کی ہے۔ ۳ جولائی ۱۹۸۶ء کو محمد مسلم صاحب کے انتقال کے ایک روز بعد جب راقم الحروف نے بحیثیت معاون مدیر انگریزی ہفتہ وار ریڈینس ان کی حیات و خدمات پر خصوصی شمارے میں ان کے تعلق سے مضامین و تاثرات کے لیے متعدد باحیات شخصیات سے بات چیت کی تو ان میں سے بیش تر کی یہی رائے تھی کہ مسلم صاحب کی تحریروں کو یکجا کر کے شائع کرایا جائے تاکہ ان پر تحقیقی کام بھی ہو سکے نیز ریسرچ اسکالر اپنے مقالے تیار کر سکیں۔ مدیر 'الرسالہ' مولانا وحیدالدین خاں کا خیال تھا کہ مسلم صاحب نے جہاں ایک جانب اردو صحافت کو بامقصد اور پرمعنی بنانے میں زبردست کردار ادا کیا تھا وہیں ان کی تحریر کا ایک اپنا رنگ اور انداز تھا جو کہ انہیں کا خاصہ تھا۔ جامعہ ہمدرد کے سابق چانسلر سیّد حامد نے تو انہیں اردو صحافت ولٹریچر میں رجحان ساز بتایا۔ انہوں نے اپنے خصوصی مضمون میں ان کی صحافت ولٹریچر کو انگریزی میں Style is the life کہہ کر پکارا۔ سابق وزیراعظم اندر کمار گجرال نے انہیں عظیم صحافی اور محبّ اردو قرار دیا۔ ماہر فن صحافت گربچن داس چندن نے روزنامہ ''ندیم'' سے لے کر دعوت اخبار تک میں ان کی تحریروں پر تحقیقی کام کی خواہش کی۔ اسی طرح ممتاز ماہر اسلامی تعلیم و قیم جماعت افضل حسین صاحب نے جامع مسجد دہلی میں ان کی نماز جنازہ میں شرکت کے بعد قبرستان مہدیان جانے کے لیے اس کی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے بڑے غمگین لب و لہجے میں کہا کہ ''ایک باب بند ہو گیا'' جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا تاریخ کا باب؟ تو انہوں نے برجستہ کہا کہ ''تاریخ ہی کا نہیں بلکہ صحافت کا بھی ایک باب۔'' لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ

اس بند باب کی منتشر تحریروں کو یکجا کر کے شائع کرایا جائے تا کہ نئی نسل ان کے دوررس افکار سے فائدہ اٹھا سکے۔ مذکورہ خصوصی شمارے میں معروف صحافی اور ان کے ایک دوست کلدیپ نیّر اور ان کے دوسرے دوست مدیر روزنامہ 'نئی دنیا' عبدالوحید صدیقی کے صاحب زادے شاہد صدیقی اور محمد شفیع مونس صاحب کے تاثرات واحساسات بھی شامل تھے۔ کلدیپ نیّر کی نظر میں وہ ایک عظیم فکری، عملی اور فنی صحافی تھے۔ البتہ مونس صاحب نے کہا کہ جماعت میں تو انہوں نے ۱۹۵۳ء سے اپنی پوری زندگی لگا دی مگر وہ جس بات کے لیے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے وہ ان کی عظیم صحافت ہے۔ عجیب بات تو یہ تھی کہ اس شمارے کو دیکھ کر ان دنوں پھر سے امارت کی ذمہ داری سنبھال رہے مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی نے تعجب سے پوچھا کہ اس میں آپ نے سب کی رائے کو جمع کر دیا ہے مگر اس میں آخر، میں سرے سے کیوں غائب ہوں؟ اس پر راقم الحروف جسے مولانا مرحوم کے رعب کے سبب رائے لینے کی ہمت نہیں ہو پائی تھی نے جھینپتے ہوئے کہا کہ 'نہیں اس میں آپ کا ذکر تو ہے'۔ تب مولانا نے تجسس سے پوچھا کہ دِکھایئے کہاں ہے؟ اس پر انہیں وہ مضمون دکھایا گیا جس میں مولانا مرحوم کے ذریعے ان کی نماز جنازہ پڑھانے کی بات تھی۔ اسے دیکھ کر انہوں نے خفا ہوتے ہوئے کہا کہ کیا میں اسی کام کے لیے ذکر کے لائق تھا؟ اسی موقع پر مولانا ابواللیث نے ۱۹۵۳ء کے واقعے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''انہیں مدھیہ پردیش میں روزنامہ 'ندیم' سے اٹھا کر دعوت اخبار تک لانے والا تو میں ہی ہوں۔'' اب تو خیر وہ اس دار فانی سے کوچ کر گئے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی تحریروں کو یکجا کر کے منظر عام پر لایا جائے۔ اور اسی طرح ان سے قبل دعوت کے اولین مدیر اصغر علی عابدی صاحب کی تحریروں پر بھی کام ہو جن کی ہم لوگ ٹھیک سے قدر نہ کر سکے۔

مسلم صاحب کی تحریروں کو جمع کر کے ترتیب دینے کی خواہش مستقل کی جاتی رہی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد تحریک اسلامی کی جانب سے انوار علی خاں سوز کی ادارت میں نکالے گئے پہلے اخبار ''الانصاف'' اور بعد میں ''دعوت'' کے سب سے پرانے تقریباً ایک صدی کی عمر تک پہنچ رہے قاری اور قوت بینائی ختم ہونے پر اسے شروع سے آخر تک پڑھوا کر ہنوز پابندی سے سننے والے سید رؤف الحسن کی آخری خواہش یہی ہے کہ وہ مسلم صاحب کی تحریروں کو کتابی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

ابھی حال میں جب مسلم صاحب کی تحریروں پر غور وفکر اور کام کے تعلق سے راقم الحروف اور سہ روزہ دعوت کے چیف ایڈیٹر عبدالحق پرواز رحمانی، عزیزی اطہر مسلم کے گھر پہنچے تو وہاں ابھی حال میں شروع ہوئے روزنامہ ''قومی سلامتی'' کے ۹۷ سالہ بانی سراج پراچہ صاحب سے ملاقات ہوئی ۔ مسلم صاحب اوران کی تحریروں کا ذکر شروع ہوا تو انکشاف ہوا کہ پراچہ صاحب مسلم صاحب کے قدیم قدرداں ہیں۔ وہ مسلم صاحب سے بے حد قریب تھے، انہوں نے ان کی ان منتخب تحریروں کو جو آج بھی اپنی معنویت رکھتی ہیں اپنے روزنامے قومی سلامتی میں وقتاً فوقتاً شائع کرنا شروع کر دیا ہے اور اسی طرح معروف حکیم سید احمد خاں کی پیش رفت سے یو این آئی کے جاوید اختر نے مسلم صاحب کی حیات وخدمات پر ایک مجلہ ترتیب دیا اور اب توسیع کر کے اسے کتابی شکل میں لانے میں مصروف ہیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ یہ سب کچھ مسلم صاحب اوران کی تحریر کی ہی قدردانی ہے۔

مسلم صاحب اس لحاظ سے بھی خوش نصیب تھے کہ ان کے بچّوں میں سے کسی نے صحافت اختیار کی تو کسی نے ان کی نوجوانی میں دوا کی دکان قائم کرنے کی سنّت پر عمل کیا۔ اتنا ہی نہیں ایک اور بیٹے اطہر مسلم نے تحریروں کو جمع کرنے کا وہ کام جو گزشتہ ۲۷ برسوں میں نہیں ہو پایا تھا کرنا شروع کر دیا اور ''کچھ یادیں، کچھ باتیں'' کا یہ مجموعہ اس کی پہلی کڑی ہے۔ میری نظر میں عزیزی اطہر مسلم کی اس کوشش کا موازنہ جسٹس جاوید اقبال کے ذریعے ان کے والد علامہ اقبالؔ کی نو برسوں میں تین جلدوں میں پیش کی گئی کتاب ''زندہ رُود'' سے کیا جا سکتا ہے۔ ان دونوں کوششوں میں جو کامن فیکٹر محسوس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ان دونوں شخصیات کے صاحب زادگان کو ان کی حیات وخدمات کو ابھارنے کے بجائے ان کے آفاقی افکار ونظریات کو منظر عام پر لانے کی فکر زیادہ ہے تا کہ ان لوگوں کے بعد کی نسلیں ان سب سے مستفیض ہو سکیں۔ یقیناً ہم سب لوگ اطہر مسلم کے ممنون ومتشکر ہیں۔ اللہ انہیں اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین۔

اے یو آصف
سینئر جرنلسٹ

□❖□

محمد مسلمؒ — ایک مردِ درویش

ممتاز اسلامی دانش ور اور تحریک اسلامی کے قد آور رہنما ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی، محمد مسلم صاحب مرحوم کے قدیم رفقاء میں سے ہیں۔ انہوں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا اور سمجھا ہے۔ وہ مسلم صاحب کی فکر اور حیات پر گھنٹوں اظہارِ خیال کر سکتے ہیں۔ ذیل میں ان کے چند احساسات پیش کیے جا رہے ہیں۔

یاد رکھے جانے والے مختلف وجوہ سے یاد رکھے جاتے ہیں، مگر مسلم صاحب کے یاد رہنے کی وجہ نرالی ہے، یہ کہ وہ بھولتے نہیں۔ آئے دن کوئی نہ کوئی بات ایسی ہو جاتی ہے کہ وہ یاد آ جاتے ہیں۔ اِس خبر پر اُن کا تبصرہ کیا ہوتا؟ اِس حادثہ کا ردّ عمل، اُس آدمی کے ساتھ اُن کا معاملہ کیا ہوتا۔ اُن کی منفرد خصوصیات کا تعلق اُن کی صحافتی زندگی سے کم، عام اِنسانی زندگی سے زیادہ تھا۔ بے لوثی، بے باکی، اِنسان دوستی، للّٰہیت، ملّی شعور، خدا پہ توکل اور اقدام اُن کا مزاج تھا۔

مسلم صاحب نے مدیرِ دعوت کی حیثیت سے جو اِداریے لکھے، اُن کے اس مجموعے سے پڑھنے والوں کو بہت کچھ مِل سکتا ہے، خاص کر نوجوانوں کو جنھوں نے بیسویں صدی کی درمیانی دہائیاں نہیں دیکھیں، اور یہ نہیں جانتے کہ اُس پُرآشوب دور میں ملت اسلامیہ ہند پر کیا گزری۔ سچ تو یہ ہے کہ اُس دور کو سمجھے بغیر مستقبل میں گلستانِ ہند کی آبیاری کا کوئی کارآمد منصوبہ نہیں بنایا جا سکتا۔ جس مسلم معاشرہ کی عکاسی ان کی تحریروں میں پائی جاتی ہے وہ آج غیر مانوس معلوم ہوں گی۔ وہ طور طریقے بھی زیادہ قابلِ عمل نہیں رہے جو اُس دور میں ہندو مسلم تعلقات

میں خوش گواری پیدا کرنے کے لیے کافی تھے، مگر وہ قدریں آج بھی تاثیر رکھتی ہیں جن کی جھلک آپ اُس معاشرت اور اُن طور طریقوں کے پیچھے کار فرما دیکھتے ہیں۔ اخلاقِ حسنہ اور اعلیٰ اِنسانی صفات، انسان کے دل و دماغ کو متاثر کرنے کی جو صلاحیت رکھتے ہیں اُن پر بھروسہ مسلم صاحب کی خصوصیت تھی۔

اِن صفحات میں پڑھنے والوں کو پرہیزگاری، خودداری اور خدا پر بھروسہ رکھنے والی شخصیات کی جوجیتی جاگتی مثالیں ملیں گی اُن سے ملنا ہر ایک کے نصیب میں نہیں ہوتا۔ آگرہ سے استاد عبدالقادر صاحب اِس کی ایک مثال ہیں۔ مسلم صاحب کے قریبی ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی کو مسلم مجلس مشاورت کے بانی کی حیثیت سے جانا جاتا ہے، مگر سی بی گپتا کے معالج کی شکل میں ڈاکٹر صاحب کا وہ روپ سامنے آتا ہے جو مسلم صاحب کے لیے کشش کا باعث بنا اور غالباً دوسروں کے لیے بھی۔ خود مسلم صاحب بائیس سال کی عمر میں سَر پر اینٹیں ڈھوکر گزارہ کرتے نظر آتے ہیں، کیوں کہ ''خاک سار تحریک'' میں ۳ دِن سے زیادہ کسی میزبان کی ضیافت نہیں قبول کی جاسکتی تھی۔

مسلم صاحب سب کو ملا کر کام کرنا مِلّی مفاد میں ضروری سمجھتے تھے۔ مسلم مجلس مشاورت کے سلسلہ میں وہ جمعیۃ العلماء کے طرزِ عمل اور ایک متوازی کنونشن کے اِنعقاد کی کہانی سناتے ہیں، مگر دِل کھول کر تنقید نہیں کرتے۔ مگر یہ خیال کرنا درست نہیں ہوگا کہ وہ زبان ہی نہیں کھولتے۔ تقسیم کے زمانے میں دہلی میں مسلمانوں پر بُرا وقت گزرا، ایک دن مسلم صاحب نے تبلیغی جماعت کے مرکز 'بستی نظام الدین' جاکر اُن سے ایک بار ہمت کر کے عرض کیا کہ ہمارے یہ بھائی سامنے پڑے ہیں۔ آپ کے پاس کارکن ہیں اُن کی خدمت کیجیے۔ ایک ذمّہ دار صاحب نے، جواب مرحوم ہو چکے ہیں، ہماری بات کاٹ کر کہا: یہ تو خدا کا عذاب ہے جس سے دور رہنا چاہیے۔

دوسروں کی طرح میں نے بھی مسلم صاحب سے بہت کچھ سیکھا، خاک ساری اور کسرنفسی کے ساتھ خود اعتمادی جو اُن میں تھی وہ کم دیکھنے میں آتی ہے۔ یہ رتبۂ بلند جسے مل گیا مل گیا۔

جماعتِ اسلامی ہند کی مجلسِ شوریٰ میں برسوں اُن کا ساتھ رہا، مگر مجھے یاد نہیں کہ کبھی

اُن کی رائے بدلی ہو۔ ہمارا اِختلاف بھی ہوتا رہا۔ ایک بار میرٹھ میں فساد ہوا۔ شوریٰ کا اِجلاس ہورہا تھا، امیر جماعت نے شفیع مونس صاحب اور مسلم صاحب کو تحقیق حال کے لیے میرٹھ بھیجا۔ معلوم ہوا، فساد کی شروعات چند مسلمان لڑکوں کی کسی حرکت کے ردّعمل میں ہوئی۔ میں نے چاہا کہ مسلم صاحب یہ بات دعوت میں لکھیں، لیکن اُنھوں نے ایسا نہیں کیا۔ تاریخ یاد نہیں، ایک بار مسلم صاحب نے اِداریہ میں سعودی عرب کے شاہ فیصل کی تعریف میں یہ بھی لکھا کہ وہ اِسلامی تعلیمات کے مطابق شورائیت پر کاربند تھے، اگرچہ اُس کا ڈھانچہ قبائلی تھا۔ میں نے اِصلاح چاہی وہ غالباً برائے اِشاعت ایک مراسلہ بھی بھیجا جو شائع نہیں ہوا۔

مسلم صاحب نے مسلمانوں کو جس لاچاری میں مبتلا پایا تھا اُس کی اِن تحریروں میں صرف ایک جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ آج صورتِ حال مختلف ہے اور جو راہ اُنھوں نے ملّت کے سامنے رکھی، جسے ہموار کرنے کی کوششیں پیشِ نظر تحریروں میں ملتی ہیں، وہ پہلے جیسی دشوار گزار نہیں رہ گئی۔ پھر بھی مسلکی تعصّبات اور انانیت کسی قابلِ لحاظ پیش رفت میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ امید ہے کہ آنے والے صفحات کا مطالعہ ہمیں اس سفر کو جاری رکھنے کی ہمت دے گا۔

ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی

(شاہ فیصل انعام یافتہ)

□❖□

مسلم صاحب — ایک یگانۂ روزگار شخصیت

تقسیم ہند کے نتیجہ میں جو سیاسی حالات برصغیر میں پیدا ہو گئے تھے، اُن سے سب سے زیادہ متاثر آزاد ہندستان کے مسلمان ہوئے۔ مسلمانوں کو اِن نامساعد حالات سے نکال کر ان کی باز آبادکاری کی پہلی ذمہ داری اُس وقت کی مسلم قیادت کی تھی جو اُس نے سخت مشکلات کے باوجود بخوبی نبھائی۔ لیکن مسلم قیادت کا یہ کام آسان نہ ہوتا اگر اس کی مدد کے لیے ذمہ دار اور دردمند صحافیوں کی ایک جماعت موجود نہ ہوتی۔ اور مرحوم محمد مسلم صاحب کا تعلق صحافیوں کی اُسی جماعت سے تھا۔ اس جماعت میں یوں تو کئی نمایاں نام ملتے ہیں، محمد عثمان فارقلیط، عبدالماجد دریابادی، اصغر علی عابدی، عابد علی خاں، جمیل مہدی، حیات اللہ انصاری، احمد سعید ملیح آبادی وغیرہ۔ لیکن ان میں مسلم صاحب کا امتیاز یہ تھا کہ وہ قول کے ساتھ عمل کے آدمی بھی تھے، گویا اُن کی صحافت ان کی عملی اور متحرک زندگی کے تابع تھی۔ وہ نہایت دردمند اور فنافی ملت انسان تھے۔ آزادی سے قبل علامہ عنایت اللہ مشرقیؒ کی خاکسار تحریک میں سرگرم تھے جسے انھوں نے بھوپال کے اخبار ندیم کی ادارت کے دوران کافی فروغ دیا۔ آزادی کے بعد جماعت اسلامی سے ان کی وابستگی بھی ان کے عملی رجحانات و میلانات کی غماز تھی۔ اخبار دعوت کا نقش اول 'الانصاف' تھا جو انوار علی خاں سوز کی ادارت میں الٰہ آباد سے ہفتہ وار کی شکل میں جاری ہوا تھا۔ ۱۹۵۳ء میں وہی اخبار دہلی سے ہفت روزہ دعوت کے نام سے جاری ہوا۔ اصغر علی عابدی اس کے مدیر مقرر ہوئے۔ ادارہ دعوت سے مسلم صاحب ۱۹۵۳ء ہی میں مدیر معاون کے طور پر وابستہ ہوئے، پھر ۱۹۵۶ء میں اس کے مدیر ہو گئے اور اِسی کے ساتھ ان کی صحافتی اور عملی زندگی کے

امتزاج کا نیا دور شروع ہوا۔ دعوت ۱۹۶۰ء میں روزنامہ ہوا۔ مسلم صاحب کو ملی اتحاد ہر چیز سے زیادہ عزیز تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ملک کی مسلم جماعتوں، تنظیموں، اداروں اور سرکردہ شخصیات کا وفاق مرحوم مسلم صاحب کا دیرینہ خواب بن گیا تھا جو ۸ر اگست ۱۹۶۴ء کو کل ہند مسلم مجلس مشاورت کے قیام کی شکل میں پورا ہوا۔ یہ فورم مسلم صاحب ہی کی مساعی کا نتیجہ تھا جو انھوں نے ڈاکٹر سید محمودؒ، مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ، ملا جان محمدؒ، مولانا محمد منظور نعمانیؒ اور ڈاکٹر عبدالجلیل فریدیؒ جیسی دردمند شخصیات کو متحرک کر کے قائم کیا تھا۔ مرحوم نے شیخ محمد عبداللہ کشمیریؒ کو بھی مشاورت میں شمولیت کی دعوت دی تھی جب ۱۹۶۴ء میں وہ جیل سے رہا ہو کر آئے تھے۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے تصور اور اس کے قیام کی کوششوں میں بھی مرحوم مسلم صاحب کا خاص حصہ رہا۔ نیز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بحالی کی کوششوں اور اِسی نوع کی ملی خدمات میں مرحوم ہمیشہ پیش پیش رہے۔ لیکن اس طرح کہ نہ کبھی خود کو نمایاں کیا نہ نمایاں ہونے دیا؛ خاموش خدمت ان کا خاص وصف تھا۔ اردو ایڈیٹرس کانفرنس کی تشکیل میں بھی مرحوم کی کوششوں کا بڑا دخل تھا۔ مرحوم کی صحافت کو ان کی عملی خدمات سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

مسلم صاحب مرحوم کا اندازِ تحریر نہایت دل کش اور منفرد تھا اور یہی چیز انھیں اپنے ہم عصر صحافیوں سے ممتاز کرتی تھی؛ دل سوزی، دردمندی، عجز و انکساری اور سب کی خیر خواہی ان کے لب و لہجے کی خصوصیت تھی۔ مرحوم کی تحریروں کا دائرہ چالیس سال سے زیادہ عرصے پر محیط ہے۔ وقت کا شاید ہی کوئی مسئلہ ہوگا ملکی یا بین الاقوامی جس پر انھوں نے اِس دوران اظہار خیال نہ کیا ہو۔ وہ موضوع کے لحاظ سے اسلوب اختیار کرتے تھے۔ دعوت کے پہلے صفحے کے تبصرے کا انداز کچھ اور ہوتا، اداریے کا لہجہ قدرے مختلف اور خبر و نظر کا رنگ دوسرا ہوتا۔ مرحوم کے ان ہی لہجوں میں سے ایک لہجہ ان کی ''یادوں اور باتوں'' کا تھا۔ ''کچھ یادیں، کچھ باتیں'' کے عنوان سے وہ اپنے کالم میں اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کا ذکر کرتے تھے۔ یہ سلسلہ ۱۹۷۹ء میں خاص طور سے اس وقت شروع ہوا جب دعوت ٹرسٹ نے وقت اور حالات کی ضرورت کے مطابق ہفت روزہ دعوت جاری کیا جو روزنامہ اور سہ روزہ دعوت کے علاوہ تھا۔ تحریروں کا یہ مجموعہ

جو اِس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے، ان کے اسی کالم پر مشتمل ہے۔ دعوت ٹرسٹ نے مسلم صاحب مرحوم کی منتخب تحریریں کتابی شکل میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ دراصل یہ کام ادارہ دعوت کے پیش نظر بہت پہلے سے تھا اور کچھ کام ہوا بھی تھا لیکن ٹرسٹ کے فیصلے کے بعد یہ کام ازسرنو شروع کیا گیا جس کے انتخاب اور تلاش و تعاون میں مسلم صاحب کے دوسرے صاحب زادے عزیزی اطہر مسلم کی محنت و جاں فشانی کا خصوصی حصہ ہے۔ پہلے مرحلے میں ''کچھ یادیں، کچھ باتیں'' کی تحریروں کا مجموعہ پیش کیا جارہا ہے۔ کالم خبر ونظر اور دیگر تبصروں اور تحریروں کا انتخاب ان شاءاللہ بعد میں پیش کیا جائے گا۔

بے موقع نہ ہوگا اگر مسلم صاحب مرحوم اور اخبار دعوت سے میں اپنے تعلقِ خاطر کا ذکر کروں۔ میں اُن چند خوش نصیبوں میں سے ہوں جنھیں مرحوم کے ساتھ رہنے اور ان کی راہ نمائی میں طویل عرصے تک کام کرنے کا موقع ملا۔ اپنے معاونین کی تربیت و اصلاح کا انداز بھی مرحوم بڑا دل نشین رکھتے تھے۔ تبصروں اور اداریوں اور خبر ونظر کے کالم کے لیے موضوع دیتے وقت محض ایک یا دو جملوں میں پوری بات سمجھا دیتے تھے۔ تیار شدہ تحریر میں ایک جملہ یا کچھ الفاظ تبدیل کر کے بعض اوقات ایک ہی لفظ بدل کر جان ڈال دیتے تھے۔ ایمر جنسی میں دعوت تقریباً ۲۲ ماہ بند رہنے کے بعد دوبارہ شروع ہوا تو جناب محمد صغیر بیدار صاحب ان کے دستِ راست اور میں ان کا معاون تھا۔ لیکن کچھ عرصے بعد صغیر صاحب اپنے بعض ذاتی مسائل کی وجہ سے اپنے وطن بھوپال منتقل ہو گئے تو مرحوم نے ان کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی۔ ایمر جنسی کے بعد مسلم صاحب اپنی طبیعت، مزاج اور میلان کے مطابق ملی کاموں میں زیادہ دل چسپی لینے لگے اور ایمر جنسی کے بعد کے حالات میں اس کی ضرورت بھی تھی۔ اس سلسلے میں ان کے قدیم رفقائے کارِ ملت اُنھی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ لہٰذا مجھے دعوت کی خدمت کا بھرپور موقع ملا۔ اِس دوران مجھے مرحوم کا مکمل اعتماد بھی حاصل رہا۔ مسلم صاحب اپنی خرابی صحت کی بنا پر ۱۹۸۲ء میں دعوت کی ادارتی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہوئے تو محفوظ الرحمٰن صاحب مرحوم ان کی جگہ مدیر مقرر ہوئے، ان کی چہار سالہ خدمات کے بعد مولانا سلمان ندویؒ کو عربی پندرہ روزہ 'الدعوۃ' کے ساتھ سہ روزہ دعوت کی اضافی ذمہ داری بھی دی گئی۔ ۱۹۸۹ء میں سلمان ندوی صاحب کے انتقال کے بعد

یہ کام مجھے تفویض کیا گیا۔ ۲۶ سال کے اس عرصے میں 'اگر دعوت اپنے اُس معیار پر جو مرحوم مسلم صاحب نے قائم کیا تھا، برقرار رہا (جس کا فیصلہ دعوت کے قدیم قارئین بہتر طور پر کر سکتے ہیں) تو اسے مسلم صاحب ہی کی نظر کا فیضان سمجھا جانا چاہیے۔

پرواز رحمانی

(چیف ایڈیٹر سہ روزہ دعوت)

❑❖❑

ابّا جان

ابا جان (جناب محمد مسلم مرحوم ومغفور) کے بارے میں میرے لیے کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے جیسا ہے، لیکن تعلق اور معاملے کی نوعیت کا تقاضا کلمۂ خیر ادا کرنے کی ترغیب دے رہا ہے۔ ان کا تعلق ملت اسلامیہ ہند کی تاریخ کے ایک نہایت نازک اور پر آشوب دور سے تھا۔ انہوں نے حالات کا گہرا اور بہت قریب سے مشاہدہ ہی نہیں کیا تھا، بلکہ وہ اس مدو جزر سے گزرے بھی تھے۔ اس مشاہدے اور تجربے نے انہیں کندن بنا دیا تھا۔ وہ انتہائی حساس انسان ہونے کے ساتھ ایک دردمند دل بھی رکھتے تھے، اس لیے ان کی آنکھوں کے سامنے ملت پر جو گزرتی تھی اس پر ان کا تڑپ اٹھنا بالکل واجب تھا۔ اس حالت کو بدلنے کا جذبہ پیدا ہونا بھی ایک قدرتی امر اور منطقی تقاضا تھا۔ ان کی زندگی اس کی گواہ ہے اور تحریریں اس کا آئینہ۔ انہوں نے ایک بھرپور زندگی گزاری جو ایک اعلیٰ وارفع مقصد اور نصب العین کے تابع تھی۔ اس مقصد اور نصب العین کو وہ ایک ایسی امانت تصور کرتے تھے جس کو ایک نسل کے بعد دوسری نسل تک منتقل ہونا چاہیے تھا۔ انہوں نے تمام عمر اپنے قول، فعل اور عمل سے اس پیغام کی فقط ترسیل وابلاغ کا ہی فریضہ انجام نہیں دیا، بلکہ اس کو عامۃ الناس کے دل ودماغ میں راسخ کرنے کی سعیٔ بلیغ بھی کی۔ ان کی تحریریں اس کی آئینہ دار ہیں۔ اس کا یہ تقاضا تھا کہ ان کی تحریروں کو محض محفوظ کرنے کی ہی کوشش نہ کی جائے، بلکہ افادۂ عام کی صورت بھی نکالی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بکھری ہوئی تحریروں کو جمع کرکے پیش کرنے کی خواہش ایک عرصے سے دل میں دبی ہوئی تھی، مگر کوئی شکل سامنے نہیں آرہی تھی۔

ادارہ 'دعوت' نے مشکل آسان کردی، راقم تحریر اس کے لیے شکر گزار ہے۔ ابا جان کا 'دعوت' سے جو تعلق رہا ہے اس پر روشنی ڈالنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ چوں کہ اب ایک راہ نکل آئی ہے، اس لیے امید ہے کہ پیشِ نظر دوسرے کام بھی آسانی سے انجام دیے جاسکتے ہیں۔ اس مجموعے میں ان کی صرف وہ تحریریں شامل کی گئی ہیں جو ہفت روزہ دعوت کے آخری صفحہ پر 'کچھ یادیں، کچھ باتیں' کے مستقل کالم کے تحت چھپتی رہی ہیں۔ ارادہ ہے کہ سہ روزہ دعوت کے معروف کالم 'خبر ونظر' کے تحت شائع ہونے والی ان کی تحریروں کو بھی یکجا کرکے اسی انداز میں پیش کردیا جائے، پھر ان کی دیگر تحریروں کو مرتب کرکے شائع کرنے کی خواہش بھی ہے۔ اس پر بھی کام ہو رہا ہے۔ ان شاء اللہ اس کو بھی انجام دینے کی کوشش کی جائے گی۔

اطہر مسلم
دہلی

ان کی آبادیاں کی آبادیاں خالی ہوگئیں اور……

ہم تیس سال کے بعد بھی اپنے ملک میں رہ رہے ہیں

یہ غالباً ۱۹۴۶ء کی بات ہے بھوپال اس زمانے میں ایک مسلم ریاست تھا اور وہاں اس وقت تک کوئی ہندو مسلم فساد نہیں ہوا تھا۔ شہر میں مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن کاروبار سب کا سب ہندوؤں یا بوہرہ حضرات کے ہاتھ میں تھا۔ صورت حال یہ تھی کہ آس پاس ہونے والے فسادات کا کوئی اثر اگر شہر میں پھیلتا بھی تھا تو سب سے پہلے ذمہ دار مسلمان ہی آگے بڑھتے تھے اور اپنے ہندو بھائیوں کو یقین دلا دیتے تھے کہ وہ اطمینان سے اپنا کاروبار کریں اور اگر ان پر کسی نے ہاتھ اٹھایا تو اس کا پہلا نشانہ خود مسلمان بنیں گے۔

اسی زمانے میں اچانک گوالیار اور ساگر کے علاقوں سے مسلمانوں کا ایک ریلا بھوپال آیا اور اس نے رو رو کر وہاں کی بپتا سنائی جس سے شہر میں ایک بے چینی سی پیدا ہوگئی۔ نواب حمیداللہ خاں اس زمانے میں ریاست کے فرماں روا تھے۔ انہوں نے ہوش مندی کے ساتھ ان آنے والوں کو شہر سے ۷، ۸ میل دور ایک فوجی کیمپ میں جو کبھی جنگ عظیم ثانی کے زمانے میں اطالوی قیدیوں کے لیے بنا تھا بھیج دیا اور شہر سے ان کا تعلق منقطع کر دیا۔ وہیں ان کے لیے غذائی اور دوسری ضرورت کا سامان فراہم کرا دیا اور اس وقت کی غالب تحریک مسلم لیگ کے رضا کاروں کو متعین کرا دیا کہ وہ ان لوگوں کی خبر گیری کریں۔ لیکن آنے والوں کے یہ ریلے برابر آتے رہے ساگر سے آنے والوں کی تعداد شاید ۵ ہزار ہوگی مگر گوالیار سے آنے والے کوئی ۳۰، ۳۵ ہزار تھے۔ کوئی گاڑی ایسی نہیں ہوتی تھی جس سے لوگوں کے قافلے نہ اتر رہے ہوں۔ اس موقع پر جذبات کی رو کا تقاضا تھا کہ ان حضرات کی زیادہ سے زیادہ مدد کی جائے اور شہر کے ہندو اور مسلمان کارکنوں نے ان کی مدد بھی کی۔

تاہم ایک خیال دل میں ابھرتا رہا کہ آخر یہ لوگ کیوں بھاگے چلے آرہے ہیں۔ جس قافلے کے لوگوں سے بھی پوچھا جاتا تو وہ یہی کہتا کہ شہر کی حالت خراب ہے لیکن متعین طور سے کوئی یہ بتانے والا نہیں تھا کہ اس فرار کی وجہ کیا ہے۔

ہم تین چار آدمیوں نے اس موقع پر یہ سوچا کہ خود گوالیار چل کر حالات معلوم کیے جائیں۔ چناں چہ ہم وہاں پہنچ گئے اور ہم نے ہندوؤں اور مسلمانوں سے مل کر حالات کا کھوج لگایا تو پتہ چلا کہ پچھلے تین ماہ میں پورے شہر میں قتل کی ۱۹ وارداتیں ہوئی ہیں جن میں سے ۱۶ وارداتیں ایسی تھیں جو ہندو برادری کے کچھ لوگوں نے اپنی ہی برادری کے افراد کو آپس کے جھگڑے میں مار دیا اور تین وارداتیں ایسی ہوئی تھیں جن میں مسلمان قتل ہوئے تھے۔ ان میں سے دو کا کھوج مل گیا تھا کہ ایک بدمعاش نے دوسرے بدمعاش کو قتل کر دیا۔ البتہ ایک گداگر ایسا تھا جس کی لاش کسی جگہ دست یاب ہوئی، مگر اس کا مجرم نہ مل سکا۔ اس تحقیقات کے بعد ہم نے وہاں کے مسلم لیڈروں میں سے سب سے ذمہ دار آدمی سے کہا کہ کیا یہ وارداتیں فرار کی ترغیب دیتی ہیں یا لوگوں میں ہمت اور استقامت پیدا کرنے کی۔ یہ صاحب اب پاکستان جا کر مرحوم ہو چکے ہیں۔ آدمی تھے صاف ستھرے اور صاف گو۔ علیحدگی میں لے جا کر کہنے لگے کہ ان کی انجمن اسلام کا جس آل انڈیا جماعت سے الحاق ہے اس کے لیڈروں کی یہ ہدایت ہے کہ لوگوں کی مہاجرت جب تک بڑے پیمانے پر نہ ہوگی اس وقت تک ان کی آل انڈیا تحریک کامیاب نہیں ہوگی اس لیے ہم اس مہاجرت کو بڑھاوا دے رہے ہیں۔

اتفاق کی بات ہے کہ اسی شام ہم چاروں افراد کا وفد وہاں کے ایک بڑے چوک سے گزر رہا تھا کہ پولیس کے ایک دستے نے ہمیں روک لیا اور کہا کہ ہم اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیں۔ ہم نے ان کے جواب میں بہت نرمی سے یہ کہا کہ ہم گرفتاری دینے کے لیے تیار نہیں البتہ آپ اگر گرفتار کرنا چاہیں تو جبر کے ذریعہ کوشش کر لیجیے۔ چناں چہ آناً فاناً پورے چوک میں چار لاریوں میں پولیس کے دستے آئے اور ہمیں گھیر لیا۔ کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ ادھر ہم نے بھی ایک دیوار کی آڑ پکڑ لی اور یہ سمجھ کر پولیس کو چیلنج کیا کہ اب کچھ دیر میں ہم بندوقوں کا نشانہ بننے والے ہیں۔ خیر عین موقع پر ایک سمجھ دار پولیس افسر آیا اور اس نے معاملہ کو رفع کرانے کی کوشش کی۔ ہم نے کہا کہ پہلے پولیس کے

دستے یہاں سے ہٹ جائیں، اس کے بعد آپ سے بات چیت کی جاسکتی ہے۔

قصہ کی طوالت کو چھوڑ کر اس ایک دستہ کا شہر کے مسلمانوں پر یہ اثر پڑا کہ جانے والے لوگوں کی تعداد اچانک کم ہوگئی اور جو ہزاروں آدمی اسٹیشن پر پڑے ہوئے تھے محبت پا کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آئے۔ جو مسجدیں بند پڑی تھیں وہ کھل گئیں اور یہ سلسلہ رک گیا۔

کئی سال کے بعد گوالیار کے ان بزرگ لیڈر کا اور ہمارا جیل میں رہنا ہوا۔ وہ بھی نظر بند تھے اور ہم بھی، ایک نئے نئے اور بڑے متعصب قسم کے چیف کمشنر وہاں پہنچے تھے۔ انہوں نے ہم لوگوں کو نظر بند کر دیا اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ ۳، ۴ دن کے بعد ہی خود جیل پہنچ گئے۔ ہمارے ان بزرگ لیڈر کی حالت جیسی پریشان کن تھی وہ دیکھی نہیں جاتی تھی۔ ڈاکٹر اور جیلر کی کیا حیثیت کہ ان کی خوشامد کی جاتی لیکن یہ ان کے آگے بھی بلک بلک کر روتے کہ کسی طرح انہیں جیل سے چھٹکارا نصیب ہوجائے۔ چیف کمشنر صاحب جب دورہ کرتے کرتے ہمارے پاس آئے تو انہوں نے کہا کہ اگر آپ جیل سے چھوٹنا چاہتے ہیں تو ایک کاغذ پر لکھ کر دے دیجیے کہ آپ پاکستان جانا چاہتے ہیں۔ ہم نے ان سے عرض کیا کہ آپ کا شکریہ لیکن ہمیں تو اپنے ملک ہی میں رہنا ہے۔ کہنے لگے کہ پھر جیل میں رہتے رہیے۔ ہم نے کہا کہ اول تو یہ آپ کے اختیار کی بات نہیں، دوسرے جب تک اللہ تعالیٰ رکھنا چاہے گا ہم سمجھیں گے کہ ہمارے لیے کام کا میدان جیل ہی میں ہے۔ وہ بزرگ وہیں پر کھڑے تھے۔ انہوں نے کہا کہ اگر وہ پاکستان جانے کی درخواست دے دیں تو کیا وہ چھوٹ سکتے ہیں۔ صاحب کا ارشاد ہوا کہ وہ بھی یہ کر سکتے ہیں اور اگر وہ چاہیں تو سات دنوں میں روانہ ہوجائیں۔

معلوم نہیں کہ ان دنوں کا جیل کا ریکارڈ موجود ہے یا نہیں لیکن وہ یہی درخواست دے کر چلے گئے اور ہم ۳۰ سال کے بعد بھی اپنے ملک میں رہ رہے ہیں۔ ان کی غلط تحریک سے ہزاروں باشندے آج بھی دانے دانے کو محتاج ہیں لیکن ان کی پاکستان سے آتی ہوئی تقریریں پھر اسی طرح تازہ دم ہوگئیں اور اس غلط تحریک، غلط قیادت اور غلط اعتماد کا نتیجہ اہل گوالیار اس طرح بھگت رہے ہیں کہ ان کی آبادیاں خالی ہوگئیں۔

(ہفت روزہ دعوت، دہلی، ۳ر فروری ۱۹۸۰ء)

گاندھی جی خاکسار کیمپ میں

بات ۱۹۴۲ء کی ہے، گاندھی جی اور مسٹر جناح ہندستان کے دو مسلّمہ لیڈر تھے لیکن دونوں کے اختلافات کافی بڑھ چکے تھے اور بہت سے لیڈر یہ کوشش کر رہے تھے کہ یہ فاصلے کم ہوں۔

علامہ عنایت اللہ مشرقی بھی ان دنوں اس سعی میں سرگرداں تھے کہ دونوں لیڈر آپس میں ملیں اور اس کے لیے انھوں نے بمبئی اور واردھا کے قریب سیوا گرام میں اپنے دو کیمپ کھولے۔ اس تحریک کا قاعدہ یہ تھا کہ اس کے کارکن کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے۔ ان کے کچھ آدمی محنت مزدوری کرنے چلے جاتے اور اسی آمدنی سے سب کا گزارہ ہو جاتا۔

سیوا گرام میں جو کیمپ لگایا گیا تھا اس میں برار کے کچھ لوگ تھے۔ ایک آدمی ضرور مرکز سے بھیج دیا گیا تھا جو اپنے کارکنوں کی نگرانی اور ان کی ضروری تربیت کرتا رہتا تھا، اسی کیمپ کے ایک شخص نے بتایا کہ گاندھی جی کا معمول تھا کہ ان کے آشرم کی روشنیاں رات کو ۹ بجے گل ہو جاتی تھیں اس کے بعد گاندھی جی صبح چار بجے اٹھتے تھے اور ٹہلنے چلے جاتے تھے۔

اس کیمپ کے لوگ بھی جن کی تعداد ۱۰۔۱۲ سے زیادہ نہیں ہوگی علی الصبح اٹھتے، قرآن مجید کی تلاوت کرتے پھر نماز سے فارغ ہوتے۔ گاندھی جی کبھی ان کے کیمپ کے پاس سے بھی گزرتے۔ ایک صاحب بڑے خوش الحان تھے جن کی آواز صبح صبح اور بھی بھلی لگتی تھی۔ اس لیے گاندھی جی وہاں ٹھہر جاتے اور تلاوت سنا کرتے تھے، ایک بار وہ خود کیمپ میں گھس آئے جہاں چاول کے پیال کی ان لوگوں نے چٹائیاں بچھا رکھی تھیں، گاندھی جی آئے تو وہیں چٹائیوں پر بیٹھ گئے اور پھر فرمائش کی کہ وہ ان کی پرارتھنا میں آکر اسے پڑھیں لیکن ان لوگوں نے انکار کر دیا۔

یہ کیمپ کئی ماہ تک وہاں لگا رہا۔ ادھر گاندھی آشرم کے بعض لوگ اسے ناپسند کرتے

تھے۔ گاندھی جی اپنے آشرم کو بہت منضبط رکھنا چاہتے تھے لیکن آشرم میں آنے والے سب لوگوں کا مزاج یکساں نہیں تھا، وہاں کی لڑکیاں باہر نکلتیں تو جوانی کی شوخیوں کا بھی ان سے مظاہرہ ہوجاتا۔ پھر یہ کیمپ ان کے لیے ایک نئی سی چیز تھی اس لیے بعضوں کی نگاہوں میں یہ بھی شرارت کا موضوع تھا۔ ایک دن کیمپ کے سارے لوگ باہر چلے گئے صرف ایک آدمی وہاں رہ گیا۔ یہ شخص تنہا بیٹھا بیٹھا کچھ گانے لگا۔ آواز اچھی اور پرکشش تھی۔ اسی وقت آشرم کی کچھ خواتین وہاں سے گزر رہی تھیں وہ اس آواز کو سن کر کیمپ میں آگئیں اور فرمائش شروع کردی کہ کچھ اور گانے سنائیں لیکن اس شخص نے انکار کردیا بلکہ خاموش ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ خواتین ایک ایک کرکے جانے لگیں اور صرف شوخ سی خاتون وہاں رہ گئی اور اس نے گفتگو کی کوشش کی لیکن عین اسی وقت ان کا سالار وہاں آگیا اور اس نے اپنے ساتھی کو فوجی انداز پر حکم دیا کہ وہ اٹھ کھڑا ہو۔ ان لوگوں نے بتایا کہ ان کے سالار نے گاندھی جی سے تنہائی میں جاکر شکایت بھی کی کہ وہ آشرم کی خواتین پر نگاہیں رکھیں۔

خواتین اور مردوں کے سلسلے میں گاندھی جی نے اپنی برہمچاری زندگی کا نمونہ رکھا تھا اور اس سلسلے میں وہ اس حد تک آگے بڑھ گئے تھے کہ غالباً ۱۹۴۶ء میں انھوں نے بنگال کے دورے میں اپنی برہمچاریت کو آزمانے کے لیے ایک ایسا تجربہ بھی کیا تھا جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ گاندھی جی نے اس کی کچھ توجیہ بھی کی تھی جو کسی کے لیے بھی اطمینان بخش ثابت نہیں ہوئی۔ اپنے آشرم میں بھی گاندھی نے اپنی مثال سامنے رکھ کر اصلاح کی کوشش کی لیکن وہ کسی حد تک کامیاب ہوئی یا نہیں اس کا کوئی ایسا نمونہ سامنے نہیں آیا جس طرح ہمارے مرشد؛ؒ کے زیر تربیت لوگ اٹھتے تھے اور ہر جگہ اخلاق کی مثال بن کر پھیل جاتے تھے۔

انسانی سماج کے دونوں شعبے مرد اور عورت کا دائرہ کار الگ الگ ہے۔ ان میں اشتراک اور تعاون بھی ہوتا ہے لیکن اختلاط کی صورتیں جب پیدا ہوں گی تو اس سے انتشار پیدا ہوگا اور شاید یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی کے بعد خود ان کے جانشینوں نے اس طرح کی کوئی ہمت نہیں کی۔

(ہفت روزہ دعوت، دہلی، ۱۷؍فروری ۱۹۸۰ء)

□❖□

یہ دین بدلنے والے

دولت اور وجاہت کی خاطر مذہب بدلنے والے کہیں کے نہیں رہے۔ بات ۱۹۶۴ء کی ہے جب مشرقی ہند کے پورے علاقے میں ایک طوفان اٹھا ہوا تھا کہ دیہاتوں تک سے مسلمانوں کو اکھیڑ دیا جائے، قصہ کا آغاز اس بات سے ہوا تھا کہ بنگلہ دیش (اس زمانے کا مشرقی پاکستان) سے غیر مسلم حضرات کی ایک تعداد پناہ گزینوں کی حیثیت سے بنگال، بہار اور اڑیسہ میں آرہی تھی اور فرقہ پرست عناصر اسے خوب ہوا دے رہے تھے۔ اڑیسہ کے کسی اسٹیشن پر جب پناہ گزینوں کا یہ قافلہ گزر رہا تھا تو وہاں کے مسلمانوں نے خیر سگالی کے طور پر یہ انتظام کیا کہ ان لوگوں کو چائے اور ناشتہ مل جائے لیکن شرارت پسندوں کو یہ انسانی محبت بھی پسند نہیں آئی اور انھوں نے اچانک یہ مشہور کر دیا کہ اس ناشتے میں زہر ملا دیا گیا ہے۔ اس کے بعد اطراف میں اور پھر چاروں طرف ایک بلوہ پھیل گیا، جس میں قبائلی عوام خاص طور سے شریک تھے۔ اس بلوے کی کہانیاں خود اس علاقے میں جا کر جو بھی سنیں وہ عجیب وغریب تھیں۔ مثلاً کھاتے پیتے مہاجن ان قبائلیوں سے سستے داموں لوٹ کا مال خرید لیتے تھے اور وہی یہ افواہیں بھی پھیلاتے رہتے تھے کہ جس گروہ کا مال ومتاع لوٹا جا رہا ہے اس کے جان ومال کو جائز قرار دے دیا گیا ہے اور اسے لوٹنے کی کھلی چھوٹ ہے۔

اسی زمانے میں ایک بڑا مسلمان ٹھیکے دار تھا جو اس علاقے میں کام کرتا تھا، غالباً تیندو کی پتی کا کاروبار تھا، یا اسی طرح کا کوئی اور کام۔ گھر میں کئی کئی بندوقیں تھیں اور دو جیپیں ہر وقت دروازے پر کھڑی رہتی تھیں۔ یہ سارا شور شرابہ جب اٹھا تو اس بدنصیب کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اپنے مال وجائداد کو بچانے کے لیے وہ کیوں نہ ہندو مذہب قبول کر لے۔ چناں چہ اس نے اس کا تذکرہ اپنی بیوی اور بچوں سے کیا لیکن بیوی بچوں نے شدھی ہونے سے انکار کر دیا۔ ادھر

کئی ہزار کا مجمع اس ٹھیکے دار کے گھر پر یورش کرنے والا تھا اور وقت بڑا نازک آچکا تھا۔ بچوں نے باپ سے کہا کہ مکان اور دولت چھوڑ کر ہمارے ساتھ نکل چلیے لیکن وہ راضی نہیں ہوا، چناں چہ اس کے لڑکوں، بیوی اور بچوں نے باپ کو اس کے حال پر چھوڑ کر جیپ سنبھالی۔ دونوں لڑکے بندوق اٹھا کر گاڑی کے دونوں جانب کھڑے ہو گئے، گھر والوں کو اندر بٹھایا اور ہزاروں کے مخالف مجمع میں سے مردانہ وار نکلتے ہوئے چلے گئے۔ کسی ایک فرد کو بھی ان پر ہاتھ اٹھانے کی ہمت نہیں ہو سکی۔

اب ان ٹھیکے دار صاحب کی بات سنیے، انھوں نے مجمع عام میں اپنے شدھی ہونے کا اعلان کیا اور مجمع نے یہ طے کیا کہ ان کو جلوس کی شکل میں شہر میں لے کر چلا جائے۔ ۴۔۵ میل کا جلوس ان صاحب کو لیے لیے پھرتا رہا۔ انھیں ہار پہنائے گئے، تلک لگایا گیا اور لوگوں نے خوب جشن سا منایا۔ اچانک مجمع میں سے کسی نے آواز اٹھائی کہ یہ شخص جان کے خوف سے شدھی ہوا ہے۔ اس لیے اس پر کوئی اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ آج اس نے یہ مذہب قبول کیا ہے، کل پھر اپنے مذہب پر واپس چلا جائے گا۔ یہ آواز کچھ ایسی مقبول ہوئی کہ ان لوگوں نے اس کے ہار وغیرہ نوچ ڈالے اور کہا جاتا ہے کہ اسے ایک درخت کے تنے سے باندھ دیا گیا اور وہیں تیر چلا چلا کر اسے چھید ڈالا۔ وہ بدنصیب مر گیا اور اس کی دولت بھی لٹ گئی لیکن اس کے بچے اب بھی اچھی حالت میں ہی ہوں گے۔

اسی پر ۱۹۵۰ء کا ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک بڑا ظالم چیف کمشنر بھوپال آیا ہوا تھا، اس سے پہلے وہاں کے اسکولوں میں ایک ہیڈ مولوی مقرر ہوا کرتے تھے۔ نام پوری طرح تو یاد نہیں، غالباً عبد القادر ہی نام تھا۔ ہیڈ مولوی کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ اسکولوں میں دینیات، فارسی اور اردو کے درجوں کی نگرانی کرے، ان ہیڈ مولوی صاحب نے سوچا کہ زمانہ بدل چکا ہے۔ اس لیے اپنی تنخواہ میں اضافے کے لیے کیوں نہ شدھی ہو لیا جائے، چناں چہ انھوں نے اس کا اعلان کیا اور اس کے بعد چیف کمشنر سے آکر ملے تا کہ ان سے کچھ داد حاصل کریں۔ ان چیف کمشنر صاحب نے خوش ہو کر داد دینے کے بجائے مولوی صاحب سے کہا کہ وہ اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیں ورنہ وہ انھیں ہٹانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ جب تم اپنے مذہب کے

پیرو نہیں رہے اور چند ٹکوں کی خاطر مذہب بدل لیا تو تم اعتبار کے لائق نہیں ہو۔ ان صاحب کو استعفیٰ دینا پڑا اور اس زمانے میں پاکستان کا راستہ کھلا ہوا تھا اس لیے وہاں وہ کوچ بھی کر گئے۔

کہنے کی بات یہ ہے کہ اگر کوئی شخص محض مال و دولت اور جاہ و منصب کے لیے مذہب بدل لیتا ہے تو اس کی نہ پڑھے لکھوں میں قدر ہوتی ہے اور نہ اَن پڑھوں میں بلکہ اسی دنیا میں اسے رسوائی نصیب ہوتی ہے۔ آخرت کی خبر خدا جانے۔

(ہفت روزہ دعوت، دہلی، ۲۴؍فروری ۱۹۸۰ء)

□❖□

ڈاکٹر فریدی اور گپتا جی

سی بی گپتا کا ابھی حال ہی میں انتقال ہوا ہے، یوپی کے وزیر اعلیٰ تھے اور سمپورنانند کے بعد وہی اس منصب پر آئے تھے۔ وزارت بھی دھڑلے سے کی، یوپی سب سے بڑی ریاست ہے لیکن کیا مجال کہ ان کی چشم ابرو کو دیکھے بغیر کوئی ادھر سے ادھر ہو جائے۔ سیاست ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھی وہ اس فن کے بڑے ماہر تھے۔ اب تو ہر گلی کوچے اور چوراہے پر حکومت پر عام تنقید کا چلن ہے اور جنتا کے ڈھائی سالہ راج میں اور کچھ ہوا ہو یا نہیں لیکن تحریر و تقریر کی آزادی خوب حاصل تھی جس کے اثرات اب بھی باقی ہیں لیکن اس سے پہلے یہ آزادی بڑی مشکل سے ان انسانوں کے نصیب میں آتی تھی جو یہاں مقہور شمار کیے جاتے تھے۔

عزت نفس، آزادی خیال اور آنکھ ڈال کر بات کرنا گویا اس زمانے میں خلاف مصلحت سمجھا جاتا تھا۔ اخبارات بہت سے تھے لیکن جو بھی برملا کسی غلطی کو غلطی کہتا تھا اس کی شامت آجاتی تھی۔ عدالتوں میں گھسیٹے جانا اور مہینوں تک لگاتار پیشیاں ڈال ڈال کر انھیں پریشان کرنا ایک وطیرہ سا بن گیا تھا۔ یوسف صدیقی صاحب مرحوم و مغفور ریڈینس کے ایڈیٹر تھے۔ راقم الحروف دعوت کا اور مولانا (عثمان) فارقلیط اخبار الجمعیۃ کے۔ اسی دلی میں نہ جانے کتنی بار انھیں سزائیں سنائی گئیں اور دل چسپ بات یہ ہوتی تھی کہ نمبری بدمعاشوں کے مختلف زاویوں سے فوٹو لینے کا جو سسٹم رائج ہے اسی طرح ہم لوگوں کے فوٹو بھی لیے جاتے تھے۔

خیر ان باتوں کا رخ تو دوسری طرف چلا گیا، کہنا یہ تھا کہ اس زمانے میں مسلمان کسی حق گو انسان کی تلاش میں رہتے تھے اور مسلمان رہنما مصالح کی خاطر یا زبان نہیں کھولتے تھے یا کچھ

کہتے تھے تو ایسی زبان میں جسے عوام نہ سمجھ سکیں۔

اس حق گوئی اور جرأت مندی کے لیے مسلمان اتنا ترستے تھے کہ کسی سے حوصلہ مندی کی کوئی بات سن لیتے تھے تو پورے ملک میں اس کی شہرت ہو جاتی تھی، اسی زمانے میں کسی بات پر برہم ہو کر مسٹر سی بی گپتا نے ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی سے یہ کہا کہ وہ انھیں پاکستان بھیج دیں گے۔ ڈاکٹر فریدی نے کہا کہ وہ تو خیر پاکستان نہیں جائیں گے، البتہ مسٹر گپتا کو ضرور پاگل خانے پہنچنے کے قابل بنا دیں گے۔

وزیر اعلیٰ کا یہ چیلنج معمولی نہیں تھا، لیکن اس سے فریدی صاحب کی حمیت جاگتی چلی گئی۔ اس کے چند دن کے بعد انتخابات ہو رہے تھے اور ڈاکٹر فریدی نے یہ کوشش کی کہ وہ جیتنے نہ پائیں۔ ترلوکی سنگھ مقابلے کے لیے کھڑے نہیں ہو رہے تھے بلکہ کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ہی انھیں اس مقابلے کے لیے آمادہ کیا، ترلوکی سنگھ کے انتخاب کی پوری مہم ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنے بل بوتے پر چلائی۔ اپنے پاس سے ایک لاکھ سے زیادہ روپیہ صرف کیا اور دن رات ایک کر کے سی بی گپتا کو ہرایا۔ اس کے بعد سی بی گپتا نے ایک اور نشست کو خالی کرا کے اس پر الیکشن لڑنا چاہا لیکن ڈاکٹر فریدی وہاں بھی ایک ایسے حریف کی حیثیت سے موجود تھے جو خود تو انتخابات میں اس وقت تک حصہ نہیں لے رہے تھے لیکن گپتا جی کے ہر مخالف کی امداد کرنے کے لیے تیار تھے۔ گپتا جی اول و آخر سیاست داں تھے، یہیں سے ان کے زوال کا دور شروع ہو گیا اور وہ شخص جو اپنے آپ کو یو پی کی قوت پر ایک وقت میں پنڈت نہرو کا جانشین سمجھنے لگا تھا تقریباً ختم ہو کر رہ گیا۔

زندگی کی اتنی چوٹ کھا کر گپتا جی کو برہم ہونا ہی چاہیے تھا، چناں چہ ان کی اور ڈاکٹر فریدی کی باہمی تلخیاں برابر باقی رہیں۔

تقدیر کی ستم ظریفی کہ ایک بار ایک ہی ٹرین سے مسٹر سی بی گپتا اور ڈاکٹر فریدی (دہلی) آ رہے تھے، گاڑی کا ڈبہ بھی ایک ہی تھا، لیکن کوپے الگ الگ تھے، غازی آباد سے کچھ آگے چل کر مسٹر گپتا پر دل کا زبردست دورہ پڑا۔ ان کی آنکھیں پھر گئیں، دانت بند ہو گئے اور دل کی حرکت بند ہونے کے قریب ہو گئی۔ ٹرین کو غازی آباد واپس کرنے اور کسی معالج کے ڈھونڈنے میں بھی دقت ہوتی اور دہلی آنے میں بھی ۴۰ منٹ کا وقت تھا۔ پورے ڈبے میں شور مچ گیا

کہ مسٹر گپتا اپنی زندگی کی آخری سانس لے رہے ہیں۔ ڈاکٹر فریدی کو معلوم ہوا کہ ان کے قدیم ترین حریف پر یہ وقت گزر رہا ہے تو وہ اپنا ایمرجنسی باکس لے کر گپتا صاحب کے کوپے میں آگئے۔ فریدی صاحب کے ایک ساتھی نے کہا کہ گپتا جی مرنے کے قریب ہیں اس لیے آپ نے کوئی دوا دی یا انجکشن لگایا تو سارا الزام آپ ہی کے سر آجائے گا، لیکن ڈاکٹر فریدی نے کہا کہ یہ ان کی اخلاقی ذمہ داری کا وقت ہے، چناں چہ انھوں نے جسم کی کچھ مالش کی اور قلب کو تقویت پہنچانے والا انجکشن لگایا۔ ڈاکٹر صاحب دل کے امراض کے ماہرین میں شمار کیے جاتے تھے اور ویسے بھی ان کی خدا ترسی اور سوز و گداز کی وجہ سے خدا نے ان کے ہاتھ میں شفا بھی عطا کر دی تھی۔ تھوڑی دیر ہی میں گپتا جی کی حالت کچھ سدھرنا شروع ہوئی چناں چہ نئی دہلی آتے ہی ڈاکٹر صاحب نے ایمبولنس منگوا کر انہیں ولنگڈن اسپتال میں داخل کیا، ڈاکٹروں کو اپنے نسخے سے مطلع کیا اور چلے آئے۔ گپتا جی اس واقعہ کے بعد بھی ۶، ۷ سال تک زندہ رہے اور جب تک جیے ڈاکٹر فریدی کا احسان مانتے رہے اور یہی کہتے رہے کہ مجھے زندگی بخشنے میں آپ کا ہی ہاتھ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہا کرتے کہ زندگی دینے والی ذات صرف اللہ کی ہے البتہ وہ کچھ اسباب پیدا کر دیتا ہے۔ اپنے لیے وہ کہتے کہ میں نے اپنا فرض پورا کیا تھا جس کے لیے میں اخلاقی اور دینی طور پر پابند تھا۔

ڈاکٹر صاحب اور سی بی گپتا میں بعد میں بھی اختلاف رائے رہا لیکن یہ اختلات رائے ایک دوسرے کے احترام کو ملحوظ رکھ کر تھا۔ ڈاکٹر فریدی کا انتقال ۱۹۷۴ء میں ہوا تھا اور بتایا جاتا ہے کہ ان کی وفات کے بعد سب سے پہلے تعزیت کے لیے پہنچنے والوں میں مسٹر سی بی گپتا تھے۔

(ہفت روزہ دعوت، دہلی، ۶/ مارچ ۱۹۸۰ء)

□❖□

قصہ ایک نوجوان کا

اب سے ۴۰، ۴۱ سال پہلے کی بات ہے۔ مسلمان عوام میں چند باتیں خصوصیت سے رائج تھیں۔ ناچ گانوں سے دل چسپی، مشاعروں، گلی کوچوں میں بیٹھ کر آدھی آدھی رات تک گپ لڑاتے رہنا، لڑنے والے لوگوں کی ٹولیاں اور ان کا محلہ وار بنیادوں پر ایک دوسرے سے لڑتے رہنا اور پھر ان مقدمات کو اعلیٰ عدالتی سطح تک جاری رکھنا وغیرہ وغیرہ۔

اسی زمانے میں ہمارے شہر میں ایک نئی وبا پھوٹ پڑی اور وہ تھی زنانوں کی ہمت افزائی۔

یہ زنانے تاریخ کے نہ جانے کس دور سے سماج کا حصہ ہیں۔ ہندستان کے شاہی خاندانوں نے ان لوگوں سے یہ خدمت لی کہ ان کو اپنی حرم سرا کا پہرے دار بنا دیا۔ ایسا بھی ہوا کہ ان کے بعض حوصلہ مند افراد کو حکومت میں دخیل ہونے کا بھی موقع مل گیا تاہم اس طبقے کو ہمیشہ ہی بری نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

ہمارے شہر میں جب یہ وبا پھیلی تو بہت سے کھاتے پیتے آدمی ان کے سرپرست بن گئے۔ ان کی ٹولیوں کی ٹولیاں ان کھاتے پیتے آدمیوں کے سہارے بڑے بڑے مجمعوں میں اپنے ناچ گانے کے کمالات دکھایا کرتی تھیں۔ آج اس محلے میں ان کا جلسہ ہوتا تھا تو دوسرے دن دوسرے محلے میں۔ ادھر عوام کی تربیت اور اصلاح کی کوئی عوامی کوشش پائی نہیں جاتی تھی یا اگر ہوتی تھی تو محدود ہونے کی وجہ سے سماج کے ہائے وہو کا رنگ بدلتا جارہا تھا اور اچھے شریف گھرانے کے بچے تک اس صف میں شامل ہونے لگتے تھے۔

آج الحمدللہ تبلیغی جماعت اور جماعت اسلامی کے نام سے اچھے خاصے پیمانے پر عوام

کا رخ موڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن اُس دور میں ایسی کوئی کوشش جاری نہیں تھی۔

میں اس زمانے میں خاک سار تحریک کا ایک کارکن تھا اور اپنے شہر کی ذمہ داری میرے سپرد تھی۔ ہم لوگ بھی اس عوامی بہاؤ کو دیکھتے تھے۔ کبھی کبھی اپنے بزرگوں سے بھی مشورہ لیتے تھے کہ آخر اس وبا کو کیسے دور کیا جائے لیکن سب خاموش ہو جاتے تھے اور یہی کہتے تھے کہ یہ فتنے کے دور کا آغاز ہے لہٰذا اس موقع پر خاموش ہو جانا زیادہ اچھا ہے۔

اسی زمانے میں ایک شریف گھرانے کے کوئی صاحب تشریف لائے اور انہوں نے کہا کہ ان کا ایک بھائی بھی اسی ٹولی میں شامل ہو گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ اپنے بھائی کو بار بار مار پیٹ چکے ہیں لیکن یہ لڑکا باز نہیں آتا۔ اس لیے اسے آپ کے حوالے کرتے ہیں کہ اس کے لیے جو اصلاح تجویز کر سکیں کیجیے۔ یہ لڑکا معمولی سا پڑھا لکھا تھا، قد بھی اچھا خاصا نکلتا ہوا اور صورت کے لحاظ سے بھی خاصا نکلتا ہوا اور خوبرو۔ ہم نے اس کے بڑے بھائی سے کہا کہ آپ اسے دینی بزرگ کے پاس بٹھا دیجیے تو انہوں نے اپنے بیسیوں تجربات بیان کر ڈالے کہ یہ بزرگ یا تو اسے دھتکار دیتے ہیں اور یہ وہاں سے مایوس ہو کر لوٹتا ہے۔ ہم نے اس سے کہا کہ ہمارے پاس ایک ہی نسخہ ہے اور وہ یہ کہ اس کے لیے خاکی کپڑے بنوا دیجیے اور اسے ہماری صف میں ایک بار داخل کر دیجیے۔

اتفاق ایسا ہوا کہ انہی دنوں شہر میں ہیضہ پھوٹ پڑا۔ اس زمانے میں علاج و معالجہ کا وہ انتظام تو تھا نہیں جو آج ہے۔ بعض بے سہارا لوگوں کی لاشیں بھی گھروں پر پڑی رہتی تھیں اور انہیں اٹھانے والا کوئی نہیں تھا۔ اسی زمانے میں ایک زنانے کا ہیضہ میں مبتلا ہو کر انتقال ہو گیا اور یہ معلوم ہوا کہ تین دن سے اس کی لاش بے گور و کفن پڑی ہوئی ہے۔ ہم لوگ وہاں گئے تو لاش کو بڑی بری حالت میں دیکھا۔ خیر ناک پر ڈھاٹے باندھ کر اس کو غسل دیا اور نماز کے بعد لے جا کر دفنا دیا۔ اس کا اثر اس برادری پر خاصا پڑا اور اس کے بہت سے افراد از راہ عقیدت ملنے بھی آئے اور ان سے گفتگو کا بھی موقع ملا، جس سے اندازہ ہوا کہ ان کی اچھی خاصی تعداد ان لوگوں کی ہے جو آوارہ ہو کر ان کے ہاتھ چڑھ گئے اور اب اپنے خاندانوں کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی شرماتے ہیں بلکہ ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں کہ وہ کس بُری زندگی میں آ پڑے ہیں۔

قصہ اس نوجوان کا چل رہا تھا۔ وہ ایک بار خاکی وردی پہن کر ہماری صف میں آملا لیکن اس کے ملتے ہی کئی پرانے خاک ساروں نے انکار کردیا کہ وہ اس کے ساتھ کھڑے نہیں ہوسکتے تاہم انہیں سمجھایا گیا۔ اس کے بعد وہ نوجوان برابر ساتھ ہی رہا اور اپنے ساتھیوں کو چھوڑ دیا یا اگر کوئی ملا تو اس کی اصلاح کی بھی کوشش کی۔ ہیضہ کا واقعہ ان لوگوں کو بھی یاد تھا اس لیے ۲، ۴ اور حضرات تائب ہوگئے۔ رہا یہ نوجوان تو اسے ہم لوگوں نے سائیکل کی مرمت کی ایک دکان کھلوادی جس کو بڑھاتے بڑھاتے اس نے ایک سائیکل کی دکان کھول لی، دکان بنوالیا اور شادی کرکے بال بچوں والا بن گیا۔

اس زمانے میں ایک بار پنجاب میں پولیس اور خاک ساروں کی ٹکر ہوئی تو یہ بھی وہاں پہنچ گئے اور سال ڈیڑھ سال ملتان جیل میں رہے۔ وہیں انہوں قرآن مجید پڑھا اور اچھے خاصے واعظ بن گئے۔

یہ صاحب اب اپنے رب سے جاملے ہیں لیکن ایک نہیں بلکہ کئی اور خاندانوں کی اصلاح ہوگئی۔ اور سچ یہ ہے کہ اصلاح پذیری کا جذبہ ہر فرد میں پایا ہی جاتا ہے۔ کمی اس کی ہے کہ ہم اپنا فرض ادا نہیں کرتے۔

(ہفت روزہ دعوت، دہلی، ۷ مارچ ۱۹۸۰ء)

□❖□

ایسی چنگاری بھی یارب……

بات زیادہ دنوں کی ہے۔ پھر بھی اگر حافظہ صحیح کام کر رہا ہے تو ایک صاحب تھے مولانا عبدالقادر صاحب۔ اب سے ۳۰ سال پہلے ان کی عمر ۶۰ سال ہوگی آگرہ کے کسی دینی مدرسے میں حدیث پڑھاتے تھے۔ مدرسے کی چھٹیاں ہوئیں تو ان کے ایک شاگرد نے جو احمد آباد کے رہنے والے تھے انہیں اپنے یہاں مدعو کیا۔ آگرہ سے احمد آباد جانے کے لیے بھوپال سے گاڑی بدلنی پڑتی تھی اور گاڑیوں کا وقت بھی ایسا تھا کہ صبح گاڑی پہنچتی تھی اور رات کو احمد آباد کی گاڑی ملتی تھی۔ مولانا عبدالقادر کے پاس سامان بھی کچھ نہیں تھا ایک جوڑا کپڑا ایک تہہ بند اور زادراہ کے لیے کچھ روپے۔ وہ بھوپال اترے تو سوچا کہ وہاں کے تاریخی مقامات دیکھ لیے جائیں۔ بھوپال کی تاج المساجد جو ایشیا کی سب سے بڑی تو نہیں پھر بھی ایک بڑی مسجد کہلاتی ہے اس کا صحن جامع مسجد دہلی اور لاہور کی بادشاہی مسجد کے برابر ہے اور چھت کا رقبہ ان دونوں سے وسیع ہے وہ ان دنوں نا تمام پڑی تھی اور بھوپال کے فرماں رواؤں کی باہمی رنجش کا شکار ہو کر ایسی حالت میں آگئی تھی کہ رات کو وہاں گیدڑوں کا بسیرا تھا اور دن میں ۱۴، ۱۵ آدمیوں کی صف ظہر اور عصر میں ہو جایا کرتی۔ آس پاس کوئی مسلم محلہ بھی نہیں تھا صرف ایک اسکول کے اساتذہ اور طلبا نماز پڑھ لیتے تھے۔ تاہم اس کی تاریخی حیثیت مشہور تھی اور دور دور سے لوگ اسے دیکھنے آتے تھے۔ (اب مولانا محمد عمران خاں صاحب امیر تبلیغی جماعت بھوپال کی کوششوں سے یہ مسجد بھی مکمل ہونے کے قریب ہے اور اس میں ایک دارالعلوم بھی قائم ہو چکا ہے)۔

مولانا عبدالقادر صاحب بھی اسٹیشن سے اس مسجد کو دیکھنے گئے۔ جاتے وقت انہوں نے

نیچے فٹ پاتھ پر ایک شخص کو پریشانی کے عالم میں پڑا پایا، اس کا تہہ بند جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور اس میں پیوندکاری بھی مشکل تھی۔ مولانا نے اپنا تہہ بند نکال کر اسے دے دیا اور مسجد دیکھنے چلے گئے۔

جب مولانا مسجد سے نیچے اترے اور اسٹیشن جانے کے لیے سڑک پر آئے تو وہ سڑک سنسان پڑی تھی البتہ پولیس کا ایک سپاہی غالباً اچھے شکار کی تلاش میں وہاں پھر رہا تھا۔ سنسان سڑک اور اجنبی سیدھے سادے مولانا عبدالقادر صاحب کو اس نے اپنے پاس بلایا اور پوچھا کہ یہاں آوارہ کیوں پھر رہے ہو؟ مولانا نے جیب سے ٹکٹ نکال کر بتایا کہ وہ احمد آباد جا رہے ہیں اور محض وقت گزاری کے لیے یہاں ٹھہر گئے تھے۔ اس زمانے میں ریاست کا دور دورہ ختم ہو گیا تھا اور باہر سے کافی پولیس والے بھوپال میں متعین کر دیے گئے تھے۔ یہ سپاہی بھی ان میں سے ایک تھا۔ اس نے مولانا سے ٹکٹ لے کر پھاڑ کر نیچے تالاب میں پھینک دیا، کپڑے کا جوڑا بھی پھینک دیا اور جو کچھ ان کی جیب میں رقم تھی اسے اپنے قبضے میں کیا اور ہاتھ پکڑ کر تھانے لے آیا جہاں انہیں دفعہ ۱۰۹ آوارہ گردی کے تحت حوالات میں داخل کر دیا تھا۔ تھانے دار کو تو خیر فرصت کہاں ہوتی، کسی ہیڈ کانسٹبل نے ان سے پوچھا کہ شہر میں کسی کو پہچانتے ہو اور جواب نفی میں ملنے پر ان کا چالان کر دیا گیا اور مولانا جیل بھیج دیے گئے۔ جیل میں بھی ان دنوں مسلمان محروسین کی رونق تھی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ کسی وارڈن نے مولانا سے گھاس چھیلنے کے لیے چلنے کو کہا اور ذرا سی دیر ہونے پر ان کے ایک چانٹا بھی رسید کر دیا۔ مظلوم اور معصوم کی آہ تھی کہ اسی دن اس وارڈن کا ہاتھ شل پڑ گیا اور اس نے سمجھا کہ ہو نہ ہو یہ مولانا کو تکلیف دینے کا نتیجہ ہے۔ اس واقعہ کے بعد اس نے آ کر مولانا سے معافی مانگی اور اس کے بعد پورے جیل میں یہ غلغلہ بلند ہو گیا کہ ایک بزرگ جیل میں آئے ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کو ستانا تو درکنار ان سے عقیدت پیدا ہو گئی۔ اسی زمانے میں کسی نے مولانا سے ان کے آگرہ کے شاگرد کا پتہ پوچھ کر ایک خط بھی لکھ دیا اور انہوں نے مجھے لکھا کہ اس نام کے ان کے ایک استاد جیل میں بند ہیں اگر تم کچھ کر سکتے ہو تو کرو۔ دفعہ ۱۰۹ کوئی ایسی دفعہ نہیں تھی جس کو جرم قرار دیا جاتا۔ انگریزوں نے اپنے دور میں پولیس کو طاقت ور بنانے کے لیے ایمرجنسی کی اس دفعہ سے ان کو مسلح کر رکھا تھا۔ اس دفعہ کے سلسلے میں اگر کوئی مقامی آدمی ملزم کی ضمانت اور مچلکہ لے لے تو اسے چھوڑا جا سکتا تھا۔ چناں چہ میں نے

عدالت میں اپنی طرف سے مچلکہ کی درخواست دی اور مولانا کو چھوڑ دیا گیا۔ مولانا جب جیل سے آئے تو غریب خانہ حاضر تھا لیکن ایک دن کے بعد انہوں نے فرمایا کہ وہ آگرہ جانا چاہتے ہیں کیوں کہ ان کے شاگردوں کا نقصان ہو رہا ہوگا۔ ہم نے سوچا کہ مولانا کو ٹکٹ اور زادِ راہ دے کر روانہ کر دیا جائے لیکن وہ اس کے لیے رضامند نہ ہوئے۔

دوسرے دن فجر کے بعد ہی مولانا عبدالقادر صاحب ناشتہ کیے بغیر کہیں چلے گئے۔ میں جب شام کو اپنے کام سے فارغ ہو کر گھر پہنچا تو دیکھا کہ مولانا بستر پر پڑے ہیں۔ تیز بخار ہے اور سر میں پٹی بندھی ہوئی ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ کہیں محنت مزدوری کرنے چلے گئے تھے لیکن اینٹوں کا بوجھ نہیں سنبھل سکا اور وہ زخمی ہو گئے۔ جس شخص نے انہیں کام پر لگایا تھا اس نے آدھے دن کی مزدوری دے کر انہیں تانگے میں ڈال کر ہمارے پتے پر بھیج دیا۔ مگر اس کے بعد بھی مولانا کا اصرار تھا کہ وہ اپنی محنت مزدوری کر کے آگرہ کا ٹکٹ حاصل کریں گے۔ تاہم ہمیں ایک بات سوجھی ہم نے مونگ پھلی خرید کر ان سے کہا کہ وہ دوپہر کو اسے دروازے پر بیٹھ کر بیچ دیا کریں اور شام کو مولانا سے کہہ دیا کریں کہ اس سودے میں آپ کا بھی حصہ ہے اور اس کی رقم یہ بن گئی ہے چناں چہ دو تین دن میں ان کے آگرے کے کرایہ اور کچھ زادِ راہ کا اسی مونگ پھلی کے نام پر انتظام کر دیا گیا اور وہ تشریف لے گئے۔

بعد میں بھی مولانا اور ان کے شاگرد کے خطوط آتے رہے لیکن چند ماہ کے بعد یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ تاہم مولانا سے میں نے اور میرے دوسرے ساتھیوں نے خودداری اور توکل کا عملی سبق سیکھا۔ اب معلوم نہیں کہ مولانا زندہ ہیں اور کہاں ہیں لیکن جی برابر چاہتا ہے کہ ایسی چنگاریوں کو دیکھ کر جو ہماری خاکستر میں پوشیدہ ہیں، حرارتِ ایمانی کو روشن کیا جائے۔

(ہفت روزہ دعوت، دہلی، ۱۶/مارچ ۱۹۸۰ء)

□❖□

جب ہم تقسیم ہوئے

۱۹۴۷ء کا زمانہ تھا۔ میں جس روز نامہ میں کام کرتا تھا اس کی خریداری بہت بڑھ گئی تھی اور کاغذ کا ذخیرہ ختم ہو رہا تھا۔ ہمیں دلی سے کاغذ منگوانا پڑتا تھا لیکن یہاں نہ ڈاک آتی تھی اور نہ جواب ہی جاتا تھا اسی لیے یہ سوچا گیا کہ کسی کو دلی جا کر کاغذ کا معاملہ کرنا چاہیے لیکن دلی آنا آسان نہیں تھا۔ تاہم یہ قرعہ میرے نام گرا کہ میں یہ کام کروں۔ دلی کا سفر اب اور پہلے بھی تفریح کی چیز تھی لیکن وہ زمانہ اتنا نازک تھا کہ اس کی ہمت کرنا اپنی جان جوکھم میں ڈالنا ہوتا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں نے چلنے کی رائے ظاہر کی تو رشتہ داروں اور احباب سب ہی نے مخالفت کی لیکن ایک تو کام ضروری تھا، دوسرے اس وقت موت کا کوئی خوف دل پر طاری نہیں تھا۔ میرے چہرے پر چھوٹی سی ڈاڑھی تھی اور سر پر جناح کیپ لگایا کرتا تھا۔ دوسرے دن ہی مجھے روانہ ہونا تھا۔ اس لیے میں نے صرف یہ احتیاط برتی کہ ڈھیلے پاجامے اور جوتے کے بیچ میں ایک خنجر رکھ لیا کہ نہ جانے کیا وقت آ جائے اور کس طرح مقابلہ ہو تو بے بسی کے ساتھ نہ مرا جائے۔ جانے سے کچھ دیر پہلے میرے ایک وفادار ساتھی اور دوست اچانک تشریف لے آئے اور اصرار کیا کہ وہ مجھے اکیلا نہیں جانے دیں گے بلکہ میرے ساتھ چلیں گے۔ میں نے بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانے۔ چناں چہ وہ بھی میری طرح خنجر سے مسلح ہو کر آ گئے، اور ہم لوگ ٹرین میں سوار ہو گئے۔

ابھی ہم ایک جنکشن تک ہی پہنچے تھے کہ کچھ پولیس والے ہر ڈبے تک یہ شور مچاتے ہوئے آئے کہ اگر کوئی مسلمان ہو تو وہ اتر آئے تا کہ ان سب کو ایک ہی جگہ بٹھا دیا جائے اور

پولیس ان کی پہرے داری کرے۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ مجھے احساس ہمیشہ کھائے جاتا رہا ہے کہ ہم دوسرے شہریوں کے مقابلہ میں اتنے کم تر اور بے بس ہوں کہ ہماری حفاظت کے لیے پولیس کے دستے لگائے جائیں۔لیکن مجبوری ایسی ہی تھی۔ چناں چہ اس گاڑی میں جو مدراس سے آ رہی تھی شاید آٹھ دس مسلمان مختلف ڈبوں سے نکال نکال کر ایک جگہ لائے گئے۔ یہ ڈاک خانہ کا کوئی بگڑا ہوا کیبن تھا۔ اسی میں ہم لوگ بند کر دیے گئے اور اس کے برابر کی بوگی میں پولیس والے بیٹھ گئے۔ گاڑی جب ایک جنکشن آ گے پہنچی تو وہاں پولیس والوں نے آ کر کہا کہ کسی کے پاس کوئی چاقو وغیرہ ہوتو وہ بھی انھیں دے دیا جائے، چناں چہ لوگوں نے قلم تراش چاقو تک جو ان کی جیبوں میں پڑے تھے پولیس کے حوالے کر دیے۔ البتہ ہمارے پاس جو خنجر تھے وہ ہم بدستور چھپائے رہے۔ آگرہ تک آتے آتے پوری بوگی خالی ہو چکی تھی صرف ہم دو اور ایک اور بزرگ وہاں رہ گئے جو آگرہ سے ہی بیٹھے تھے۔ ہم نے ان سے کہا کہ ہم اس بوگی کو خطرناک سمجھ رہے ہیں، اس لیے ہم بھی کہیں اور جا کر بیٹھتے ہیں اور آپ بھی چاہیں تو ہمارے ساتھ آ جائیے اور چاہیں تو کہیں اور جا کر بیٹھ جائیے۔ جب ہم دوسری بوگی میں جا کر بیٹھے تو سارے مسافروں کی نگاہیں انتہائی غضب ناک تھیں، تاہم ایک چھوٹی سی جگہ دیکھ کر ہم بیٹھ گئے۔ مجھے اس وقت ایک نیا خیال آیا۔ میں نے اپنے ساتھی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس کی لکیریں پڑھنا اور بتانا شروع کر دیں۔ دل میں آنے والے خطرات سے اندیشے کے لحاظ سے کلام پاک کی سورتوں کا ورد تھا اور ہاتھ علم الید کی کنجی کھولنے میں مصروف تھے۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے جیل ہی میں اتفاق سے لکیروں کی ایک کتاب پڑھی تھی اور اگر چہ اس پر کبھی یقین نہیں رہا مگر کچھ موٹی موٹی باتیں ذہن میں موجود تھیں۔

ہمارے ملک کے لوگ ہمیشہ ہی سے توہم پرست رہے ہیں۔ پھر جو اجڑے سندھی اور سکھ وہاں موجود تھے اور جن کو اپنا مستقبل جاننے کی از حد تمنا تھی ان کے لیے یہ تدبیر کامیاب رہی اور ان میں سے ہر ایک نے اپنا ہاتھ دکھانے کی خواہش بھی کی اور اپنے پاس جگہ بھی دی۔ ادھر متھرا کے اسٹیشن پر پولیس والے ہمیں ڈھونڈتے ہوئے ہماری بوگی میں آ گئے اور کہا کہ ان کے ساتھ چل کر اس پرانے قید خانے میں بند ہو جائیں لیکن قریبی مسافر ایک تو اپنی قسمت کا حال

معلوم نہیں کر سکے تھے، دوسرے انھیں ہم سے ہمدردی بھی پیدا ہوگئی تھی اس لیے انھوں نے ہم سے بھی کہا اور پولیس والوں سے بھی کہ ہم لوگ یہیں رہیں گے۔

مجھے یاد ہے کہ شام ۴، ۵ بجے کا وقت ہوگا۔ اس وقت نئی دہلی کا اسٹیشن آیا۔ پولیس والوں نے ہم سے کہا تھا کہ ہم وہاں اتر جائیں تو اچھا رہے گا لیکن باہر پلیٹ فارم پر نظر ڈالی تو ہر طرف مسلح سکھ گھوم رہے تھے۔ اس لیے پرانی دلی اسٹیشن پر اترنے کا فیصلہ کیا اور وہیں جا کر اترے۔ وہاں بھی ہر جگہ پناہ گزینوں کے غول کے غول گھوم رہے تھے، تاہم اسی مجمع سے نکل کر ہم نے سوچا کہ کسی طرح جامع مسجد پہنچنا چاہیے اور تانگے کی جگہ پیدل ہی چلنا زیادہ مناسب ہوگا۔ چناں چہ کارپوریشن کے پاس کمپنی باغ میں آئے۔ یہاں اس زمانے میں ایک مسجد ہوا کرتی تھی جو اس وقت اجڑ گئی تھی اور اب معدوم کردی گئی ہے۔ اس کے قریب سے ہو کر چاندنی چوک آئے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اسی وقت دو سانڈ آپس میں لڑ پڑے اور ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ دوسری طرف جامع مسجد جانے والی ٹرام آ رہی تھی اس لیے اس میں جلدی سے بیٹھ کر جامع مسجد آ کر دم لیا۔ یہاں ہمیں ایک عزیز کے ساتھ ٹھہرنا تھا مگر وہ پاکستان جا چکے تھے۔ دکانیں اجڑی ہوئی، ہوٹل مفقود، کھانے تک کا ایک ہوٹل موجود نہیں اس لیے جائیں تو کہاں جائیں۔ جامع مسجد کے دالانوں میں کچھ مسلمان پناہ گزیں پڑے تھے سوچا کہ وہیں جا کر سو جائیں۔ کاغذ کی خریداری کو آئے تھے، اس لیے تین چار ہزار روپے بھی پاس تھے۔ یکا یک ایک دوست کا (جواب بھی بقید حیات ہیں) خیال آیا اور وہ اتفاق سے مل بھی گئے۔ مگر ان کا حال بھی یہی تھا کہ اکیلے تھے اور کھانے پینے کے ذرائع مفقود تھے۔ جامع مسجد کا ایک بڑا ہوٹل جس کی پگڑی آج شاید دو لاکھ روپے ہو، چار سو روپے میں فرنیچر کے ساتھ ہوٹل دینے کو تیار تھا لیکن جو جگہ ہمیں مل گئی تھی اسی کو غنیمت سمجھا اور کھانے پینے کے لیے یہ طریقہ سوچا کہ جامع مسجد کے آس پاس کباڑی بازار میں غیر مسلم قیمتی قیمتی چیزیں اور کھانے کا پکا ہوا سامان مثلاً مچھلی کے ڈبے یا انڈے کا پاؤڈر وغیرہ بیچتے اور اونے پونے لے آتے۔ کہیں سے مٹی کے تیل کا انتظام ہو ہی جاتا تھا، اسی میں پکاتے اور کھا لیتے۔

یہ زمانہ جیسا کچھ بھی تھا آج کی نسل اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ راستے میں سڑکوں پر

لاشیں پڑی دکھائی دے رہی ہیں۔ کرفیو کا دور دورہ تھا۔ جامع مسجد کے علاقے میں اگرچہ کچھ لوگ سرگرم نظر آتے تھے جو ہر موقع پر جا پہنچتے تھے تو وہ میر مشتاق احمد تھے یا چودھری عبدالستار مرحوم اور ان کے دو تین جاں باز ساتھی۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بھی یہاں گشت لگانے آجاتے تھے۔ ایک صاحب جو ۱۹۴۷ء سے پہلے نیشنلسٹ تھے انھیں بھی سرکار نے گشتی مجسٹریٹ بنا دیا تھا اور ان کے بارے میں سنا کرتے تھے کہ مسلم لیگ کے لوگوں کو جو ابھی باقی رہ گئے تھے خوب ڈرایا کرتے تھے کہ اور لوگوں کا نہیں بلکہ ان کا جذبۂ انتقام ان پر ٹوٹ پڑنے والا ہے۔ مولانا احمد سعید صاحب کو بھی دیکھا کہ وہ علاقے کے لوگوں کے لیے انتہائی مشفق اور بے جگری کے ساتھ ان کے لیے لڑتے تھے۔ غیر مسلم لیڈروں میں سے مسز سبھدرا جوشی بھی اس کام میں لگی رہتی تھیں کہ مظلوموں کی حمایت کریں۔

وقت تو آتے جاتے رہتے ہیں لیکن کہنا صرف یہ ہے کہ اس ملک کی پرانی نسل کو کن کن مشکلات سے گزرتے ہوئے اپنا سفر طے کرنا پڑا ہے۔ لیکن خدا اعتمادی اور خود اعتمادی سے یہ ملت برابر آگے بڑھتی رہی ہے۔

(ہفت روزہ دعوت، دہلی، ۲۳ر مارچ ۱۹۸۰ء)

□❖□

تقسیم کے زخم

خدا جس کو زندہ رکھے اس کو کوئی مارنے والا نہیں۔ پچھلی بار دلّی کے ایک سفر کی بات کر رہا تھا جو ۱۹۴۷ء میں بلووں کے شباب کے دور میں کرنا پڑا تھا۔ میں اپنے روزنامے کے لیے کاغذ لینے آیا تھا جس کا کاروبار ہمیشہ سے دلّی کی مشہور فرم جے این سنگھ سے ہوا کرتا تھا۔ اس زمانے میں بھی کرفیو کے اوقات کے علاوہ یہ فرم کھلا کرتی تھی۔ اس کے منیجر غیر مسلم تھے اور مسلمانوں سے نفرت کا وہ خاص دور تھا لیکن ان کی خندہ پیشانی میں کوئی کمی نہیں تھی۔ ملاپ، پرتاپ بھی یہیں آچکے تھے۔ رسالہ شمع بھی کثیر الاشاعت تھا۔ پھر انگریزی اخبارات کے گودام بھی کاغذ سے خالی تھے۔ اس لیے ہوتا یہ تھا کہ کرفیو کھلتے ہی سب اخباروں کے مدیر اس فرم میں آ کر بیٹھ جاتے اور جس کو جس سائز کا جتنا کاغذ مل سکتا تھا حاصل کر لیتا تھا۔ بڑے بڑے اخبار بھی ۴، ۵ ریم کاغذ کو غنیمت سمجھتے تھے اسی میں ہمارا بھی نمبر آ جاتا تھا۔ جس دن اس فرم میں حاضری میں دیر ہوگئی وہاں کا کاغذ مارا جاتا تھا۔

دوسرا سوال ہم لوگوں کے لیے یہ تھا کہ یہ کاغذ اپنے مستقر پر کیسے پہنچایا جائے۔ جے این سنگھ کی فرم اس کے لیے تیار نہیں تھی کہ ریلوے کی ذمہ داری بھی وہ لے۔ ان کا کہنا تھا کہ شہر میں ہر طرف قتل و غارت گری ہے اس لیے وہ اپنا آدمی اسٹیشن بھیجنے کے لیے تیار نہیں۔ پھر ان سے زیادہ مشکل ہمارے لیے تھی۔

اس زمانے میں دلّی کے چیف کمشنر ایک مسلمان تھے۔ علی گڑھ کے رہنے والے خورشید احمد خاں۔ اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ بہت شریف آدمی تھے لیکن حالات نے انہیں بالکل ناکارہ بنا کر رکھ دیا تھا۔ ان سے تھوڑی سی واقفیت تھی، اس لیے سوچا کہ ان سے اس مشکل کا حل تلاش

کرنے میں مدد لی جائے۔ جامع مسجد سے لڈلو کیسل میں جہاں ان کی قیام گاہ تھی کوئی ۴ کلومیٹر کا فاصلہ ہوگا۔ موٹر یا تانگہ پر جانا خطرناک تھا اور پیدل جانے میں لال قلعہ کے سامنے کی سنسان سڑک۔ پھر کشمیری گیٹ کا ناراض علاقہ اور اس کے بعد پھر راہ گیروں کے لیے دن دہاڑے قزاقی کے مرکز۔ تاہم ضرورت شدید تھی، اس لیے ان کے یہاں کسی نہ کسی طرح پہنچے مگر انھوں نے اس معاملے میں اپنی بے بسی ظاہر کر دی۔ وہاں سے ہم واپس آ رہے تھے تو سوچا کہ موری گیٹ کی طرف سے ہوتے ہوئے چلے آئیں۔ غالباً ۱۱، ۱۲ بجے کا وقت ہوگا۔ پوری سڑک سنسان پڑی تھی بس میں اور میرے ساتھی چلے جا رہے تھے کہ دوسری طرف سے دو نوجوان سکھ ایک سائیکل پر آتے ہوئے دکھائی دیے۔ انھوں نے ہمیں دیکھا تو ٹھہر گئے۔ تلواریں ان کے ہاتھ میں تھیں اور ہمارے پاس خنجر تو تھے لیکن اس سے زیادہ توتوکل تھا کہ اس موقع پر بھاگنے کی بجائے مقابلے کی ضرورت ہے۔ رہی زندگی اور موت تو یہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ یہ بھی حوصلہ تھا کہ اگر ۵، ۱۰ اور مخالفین آ جائیں تو ان سے بھی نمٹ لیا جائے گا۔ ہم لوگ سڑک کے ایک طرف کھڑے تھے اور وہ دوسری طرف، میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ اگر یہ حملہ کریں تو آخر دم تک مقابلہ کرنا اور ہرگز نہ بھاگنا۔ ان حضرات نے وہیں سے کھڑے کھڑے ہم سے پنجابی میں پوچھا کہ تم مسلمان ہو۔ ہم نے کہا کہ اللہ کا شکر ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔ کہنے لگے کہ وہ پاکستان میں آرام سے رہتے تھے انہیں مسلمانوں نے اجاڑ دیا۔ ہم نے کہا کہ یہ بُرا کیا۔ پھر کہنے لگے کہ راستے میں ہم نے بھی مسلمانوں کے خاندانوں سے اس اس طرح کے بُرے سلوک کیے۔ ہم نے کہا کہ یہ بات بھی بُری تھی۔ کہنے لگے تم یہاں اب بھی رہتے ہو۔ یہ سب جواہر لال کی وجہ سے ہے۔ ہم نے بہت نرمی سے کہا کہ ہم مسلمان کسی گاندھی اور کسی جواہر لال کے سہارے زندہ نہیں ہیں بلکہ اللہ کے بھروسے پر رہ رہے ہیں۔ اسی اثنا میں ان میں سے ایک شخص نے تلوار اٹھا کر ہماری طرف بڑھنا چاہا لیکن اس کے دوسرے ساتھی نے اسے روک دیا کہ دیکھتے نہیں کہ یہ لوگ کس اطمینان سے کھڑے ہیں اس لیے ان سے نہ الجھو۔ چناں چہ وہ فوراً ہی سائیکل پر بیٹھ کر اور ہمیں گالیاں دیتے ہوئے موری گیٹ کا رخ کر لیے۔

یہاں اس زمانے میں دو تین گھنٹے کاغذی کے یہاں حاضری دینے کے بعد باقی وقت فارغ رہتا تھا۔ اس وقت ہمایوں کے مقبرے میں مسلمان پناہ گزینوں کے ہجوم کے ہجوم پڑے

ہوئے تھے۔ مسلم لیگ کے کچھ کارکن وہاں کام کر رہے تھے لیکن ان کے مزاج میں خدمت سے زیادہ رعونت اور بازاری پن نظر آیا۔ وہیں سامنے تبلیغی مرکز تھا۔ ہم اکثر ہمت کر کے بستی نظام الدین چلے جاتے تھے کہ اگر ہم سے کوئی خدمت ممکن ہو سکے تو کی جائے۔ ان سے ایک بار ہمت کر کے عرض کی کہ ہمارے یہ بھائی سامنے پڑے ہیں آپ کے پاس کارکن ہیں، ان کی خدمت کیجئے۔ ایک ذمہ دار صاحب نے جواب مرحوم ہو چکے ہیں ہماری بات کاٹ کر کہا کہ یہ تو خدا کا عذاب ہے جس سے دور رہنا چاہیے۔

ہاں جامعہ ملیہ اسلامیہ سے دس بارہ باہمت پروفیسر اور ان کے شاگرد ضرور یہاں روزانہ آتے تھے اور جو بھی خدمت ممکن ہوتی تھی کرتے رہتے تھے۔ غالباً اختر حمید خاں جامعہ کے اس قافلے کے سردار ہوتے تھے۔ خدا ان کی مغفرت کرے، بڑے دردمند مسلمان تھے۔ روزانہ یہاں سے نظام الدین اسٹیشن پر قافلے جاتے۔ روزانہ پاکستان سے ہوائی جہازوں سے روٹیاں آتیں اور روزانہ حکومت ہند بھی کھانے پینے کا انتظام کرتی لیکن بیش تر رضا کاروں کا یہی حال دیکھا کہ وہ اس مصیبت کے دور میں بھی دولت کمانے اور عیش کوشی کے لیے جیسے آمادہ نظر آتے تھے۔ جلانے کے لیے لکڑیاں یا کوئلے نہیں ملتے تھے بلکہ نیم کے درختوں کی چھال کو مرد اور عورتیں ناخنوں سے اکھاڑ کر آگ کا کچھ انتظام کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ وہیں یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ ایک دولت مند طوائفوں کے مجرے بھی کرایا کرتے تھے۔ ایک رئیس کے پاس بے پناہ دولت تھی لیکن یہ سنا گیا کہ وہ دل شکستہ ہو کر نوٹوں کی گڈیوں سے ہاتھ تاپا کرتے تھے۔

یہ بُرے دن گزر رہے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپس کی ہمدردیاں مفقود ہو گئی تھیں۔ مصیبتوں میں اب جو آپس کا لگاؤ پیدا ہوتا رہتا ہے اس کیمپ میں اس جذبے کو کم ہی محسوس کیا گیا اور غالباً یہی وہ عنصر تھا جس نے پاکستان پہنچ کر صرف اپنی ذات کو ملحوظ خاطر رکھا۔

یہ زمانہ گزر گیا لیکن اب بھی جب ان واقعات کی یاد آتی ہے تو یہی جی چاہتا ہے کہ ملت میں اپنی کمزوریوں کا احتساب کرنا اور باہمی ارتباط اور خدمت کے جذبے کو بڑھانا صرف ایک دینی ضرورت ہی نہیں بلکہ باعزت انسان کی طرح زندگی گزارنے کے لیے بھی یہ ضروری ہے۔

(ہفت روزہ دعوت، دہلی، ۳۰ / مارچ ۱۹۸۰ء)

□❖□

یادِ رفتگاں

ڈاکٹر سید محمود صاحب کو آج کے نوجوان فراموش کرتے جارہے ہیں لیکن ایک وقت تھا جب یہ تحریک آزادی کے ان لوگوں میں شمار ہوتے تھے جن کے استدلالی انداز کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔ کانگریس کے جنرل سکریٹری تھے اور پنڈت نہرو کے دست راست۔ دونوں میں بے پناہ دوستی بھی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے بہت سے افکار سے لوگوں کو اتفاق نہیں تھا لیکن ان کے خلوص کی ہر جگہ قدر کی جاتی تھی۔

کانگریس جب برسرِ اقتدار آئی تو مرکزی حکومت میں مولانا آزاد کے بعد مسلمانوں میں انہی کا مقام سمجھا جاتا تھا۔ وزارت خارجہ میں وزیر مملکت بھی رہے اور لوک سبھا اور راجیہ سبھا میں بار بار منتخب ہوتے رہے۔ دوسرے لیڈروں کے برعکس انھوں نے جانی قربانیوں کے علاوہ مالی ایثار بھی پیش کیے۔ پٹنہ کا صداقت آشرم ان کے خاندان کی یادگار ہے جو کانگریس کی تحریک آزادی کا مرکز بنا اور اب تک کانگریس کے لیے وقف ہے۔ مرحوم کے خیالات پڑھنے اور ان پر ہونے والی تنقیدوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوتا رہا تھا لیکن ان سے پہلی ملاقات جبل پور کے المناک فساد کے بعد ہوئی۔ فسادات بلکہ یوں کہیے کہ بلوے ایک طرح سے روزمرہ کی وارداتیں بن چکی تھیں لیکن ۱۹۶۱ء کے اس بلوے میں پہلی بار یہ بات سامنے آئی کہ فرقہ پرست عناصر نے ایک مسلمان گھر میں آگ لگا کر اس کے مکینوں کو جن میں چھوٹے چھوٹے بچے بھی شامل تھے زندہ جلا دیا اور پھر یہ تباہی کا سلسلہ شروع ہوا تو جبل پور سے لے کر ساگر تک کی اکثر مسلمان بستیاں تہس نہس کر دی گئیں۔ ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو اس زمانے میں مدھیہ پردیش کے وزیر اعلیٰ

تھے۔ ان بلووں کی خبریں افواہوں کی شکل میں تو ہر جگہ گرم تھیں لیکن کسی اخبار میں کوئی اطلاع نہیں شائع ہورہی تھی اور شاید خفیہ پولیس نے بھی مرکزی اور ریاستی حکومتوں کو ان واقعات سے بے خبر رکھا تھا۔

اس زمانے میں پہلی بار اخبار اسٹیٹس مین کے ایک نامہ نگار نے بھوپال سے ٹیکسی پر ساگر اور جبل پور کا سفر کیا اور اپنی رپورٹ شائع کی جس سے ایک تہلکہ سا مچ گیا۔ اسی کے بعد وزیراعلیٰ کاٹجو بھی جبل پور گئے اور جب اخبار نویسوں نے ان سے دریافت کیا کہ انھوں نے اس شہر میں کیا حال دیکھا تو کہنے لگے کہ میں نے اس کو شہر نہیں بلکہ شمشان (مرگھٹ) کی شکل میں دیکھا ہے۔ مسلمانوں کے محلے کے محلے اجاڑ دیے گئے تھے اور ایک دو محلوں کے علاوہ ساری مسلمان آبادی کیمپوں میں پڑی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر سید محمود صاحب سے اسی زمانے میں پہلی ملاقات ہوئی۔ وہ پارلیمنٹ کے ممبر تھے اور کانگریس کے بزرگ ترین لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا لیکن جبل پور کے لرزہ خیز واقعات نے انہیں بے چین کردیا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ اور مولانا ابواللیث صاحب نے جمعیۃ علماء اور جماعت اسلامی کی طرف سے مشترکہ ریلیف کا ایک منصوبہ بنایا تھا۔ اسی اشتراک عمل نے یہ احساس بھی پیدا کیا کہ ملک کی تمام مسلمان جماعتوں اور ممتاز دینی افراد کا اجتماع ہو، تاکہ اس صورت حال پر غور کیا جائے۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ اور مولانا ابواللیث صاحب میں اس اجتماع کی تفصیلات بھی طے ہوگئیں اور ایک متفقہ فہرست بھی تیار ہوگئی کہ کن لوگوں کو بلایا جائے۔ مولانا مرحوم کو مسلم لیگ کی موجودگی پر اعتراض تھا لیکن مولانا ابواللیث صاحب کو اصرار تھا کہ جب ہم کلمہ گو ہونے کی بنا پر سب لوگوں کو بلا رہے ہیں تو مسلم لیگ کو نظر انداز کردینا صحیح نہیں، چناں چہ مولانا اس پر راضی ہوگئے۔ مولانا مرحوم کا خیال تھا کہ وہ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب، مولانا ابواللیث صاحب، مولانا ابوالحسن علی صاحب اور ڈاکٹر سید محمود صاحب وغیرہ اس کنونشن کے داعی ہوں۔ لیکن مولانا ابواللیث صاحب نے کہا کہ آپ ہی داعی بنیں اور ہم سب کو مدعو رکھیے۔ ان دونوں حضرات کا منشا بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ مولانا مشترکہ کنونشن کو مشترکہ ناموں کے ساتھ بلانا چاہتے تھے اور مولانا ابواللیث صاحب ازراہ انکساری یہی چاہتے

تھے کہ کوئی بھی جماعت ایسا اجتماع بلالے لیکن اس کو کامیاب بننا چاہیے۔

۱۹۶۱ء کا آج ۱۹۸۰ء سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس وقت پنڈت نہرو کا دب دبا تھا اوران کا انداز فکر یہ تھا کہ مسلمان صرف نماز روزہ اور عبادتوں میں گھر کر رہ جائیں، اس سے آگے ان کے بارے میں جو کچھ سوچنا ہے اس کے لیے کانگریس کافی ہے۔ اس کنونشن کی خبر جب پنڈت جی کو پہنچی تو انھوں نے ڈاکٹر سید محمود پر دباؤ ڈالا کہ وہ کنونشن کی صدارت نہ کریں اور مولانا حفظ الرحمٰن سے کہا یا کہلوایا کہ وہ اس کا ارادہ ترک کردیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب بھی اپنی جگہ قائم رہے اور مولانا نے بھی ان کی رائے ماننے سے انکار کردیا بلکہ کسی طرح دلّی کے ایک اخبار میں یہ خبر بھی ان کے نام سے منسوب ہوگئی کہ وہ کانگریس کو چھوڑ دینے کے لیے تیار ہیں۔ پنڈت نہرو نے اس کے بعد دوسری حکمت عملی یہ اختیار کی کہ مسلم کنونشن تو ہو مگر وہ سیکولر ہو جس میں کمیونسٹ، سوشلسٹ اور کانگریسی شریک رہیں لیکن مسلم تنظیمیں شریک نہ کی جائیں۔ اس سلسلے میں پنڈت جی نے حافظ ابراہیم مرحوم کی خدمات استعمال کیں اور راتوں رات ساری پرانی فہرستیں بدل کر نئی فہرستیں بنادی گئیں۔ غالباً اس فہرست میں دو نام جماعت اسلامی کے لوگوں کے تھے۔ مسلم لیگ، اتحاد المسلمین اور تعمیر ملت وغیرہ بالکل غائب تھے۔ مولانا علی میاں کا البتہ نام تھا۔ مولانا ابواللیث صاحب نے یہ کہہ کر معذرت کردی کہ یہ کانفرنس کلمہ گو ہونے کی بنا پر بلانا طے ہوا تھا اور جب مسلمانوں کی تنظیموں کو نہیں بلایا ہے تو ان کی حاضری بھی فضول ہے، البتہ مولانا ابواللیث صاحب اور موجودہ امیر جماعت مولانا محمد یوسف صاحب نے ہمیں یہ ہدایت کی کہ اس کانفرنس کے ساتھ پورا تعاون کیا جائے۔ غالباً اسی طرح کی کوئی معذرت مولانا علی میاں صاحب نے بھی کردی تھی۔ ڈاکٹر سید محمود صاحب البتہ اس میں صدر کی حیثیت سے شریک ہوئے اور اس میں اپنا وہ مشہور خطبۂ صدارت پڑھا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ مسلمانان ہند کو دوسرے درجہ کا شہری بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔

پنڈت نہرو وضع دار انسان تھے اور ڈاکٹر محمود صاحب کی شخصیت اور قربانیاں بھی کسی سے کم نہیں تھیں مگر اسی وقت اور اسی جملے سے ان دونوں میں کھٹک گئی۔ پنڈت جی یہ سمجھتے تھے کہ ہندستانی مسلمان ان کی جیب میں پڑے ہوئے ہیں لیکن انھی کے ایک ساتھی نے جب اس

موقف میں آنے سے انکار کر دیا تو وہ ان سے ہمیشہ کے لیے ناراض ہو گئے۔

ادھر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اس کنونشن کے کچھ دن کے بعد مہلک بیماری میں مبتلا ہو گئے اور ہمیں یاد ہے کہ ایک بار جب مولانا ابواللیث صاحب اور میں ان کی عیادت کو گئے تو انھوں نے آنکھوں میں آنسو بھر کر مولانا سے کہا کہ آپ یقیناً مجھ سے ناراض ہوں گے مگر اب اسے بھلا دیجیے اور مولانا نے بھی کہا کہ اس موضوع پر غور کر کے آپ دل گرفتہ نہ ہوں۔

مولانا مرحوم اور ڈاکٹر سید محمود صاحب اب ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کی خوبیاں یاد آتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب تو نسبتاً آزاد تھے لیکن مولانا مرحوم بہت سے ارکان شوریٰ میں گھرے رہتے تھے اور ان میں سے بعض کی تنگ ذہنی کی انہیں رعایت بھی کرنی پڑتی تھی۔ دل کے ایسے صاف انسان اب اس گروہ میں خال خال ہی رہ گئے ہیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا اسی زمانے کا ایک واقعہ ہے۔ کسی پریس کانفرنس میں روزنامہ دعوت کے ایک کارکن بھی شریک تھے اور انھوں نے بعض آڑے ٹیڑھے سوال پوچھ لیے تھے۔ ان صاحب نے جب مجھے بتایا تو میں نے انھیں سمجھایا کہ اپنے بزرگوں سے ہم سب لوگوں کو اس انداز کی گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔ اتفاق سے اسی دن مولانا مرحوم سے کہیں ملاقات ہو گئی تو انھوں نے چھوٹتے ہی ان صاحب کی شکایت شروع کر دی۔ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ اردو صحافت اور خصوصاً نامہ نگاروں میں مسلمانوں میں کوئی آگے آتا ہی نہیں۔ اب اگر کچھ لوگ آ رہے ہیں تو ان کی کمزوری کو حریفانہ طور پر غور نہیں کرنا چاہیے۔ یہ نوعمر بچے ابھی یونیورسٹیوں سے نکلے ہیں، ان کی اصلاح آپ لوگ نہ کریں گے تو کون کرے گا۔ اس کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ان صاحب سے بڑی محبت سے پیش آنے لگے۔ ان کے جانشینوں میں سے یہ اسلامی قدریں اب دھیرے دھیرے رخصت ہو گئیں اور شاید اب وہ احساس بھی رخصت ہوتا جا رہا ہے جو کبھی مسلمانوں کے باہمی روابط کو مستحکم بناتا رہتا تھا۔

(ہفت روزہ دعوت، دہلی، ۲۷ / اپریل ۱۹۸۰ء)

□❖□

ایک یادگار کنونشن

پچھلے ہفتے ۱۹۶۱ء کے مسلم کنونشن کا تذکرہ آیا تھا۔اس موقع پر دہلی کے مسلمانوں کا ایک دانش ور طبقہ یہ چاہتا تھا کہ وہ اس میں شریک ہو اور جب اسے سیکولر بنا دیا گیا تو اس نے یہ چاہا کہ اس کا بائیکاٹ کرے اور شہر میں ہر طرف اس کے خلاف فضا پیدا کی جائے۔ان میں سے بعض لوگ اب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور بعض بحمدہ بقید حیات ہیں۔ایک دن ان حضرات میں سے ایک صاحب کا دعوت نامہ ملا کہ اسی شب میں ان کے یہاں ایک نشست ہے جس میں مجھے بھی شریک ہونا چاہیے۔وہاں جا کر دیکھا تو ۲۰، ۲۵ ممتاز اصحاب شریک مجلس تھے اور ان کا ذہن اس بات کے لیے تیار ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کے نام سے اگر کوئی کنونشن بلایا جائے اور وہ کوئی آگے کی راہ نکال سکے تو اس کی مذمت کے پروگرام بنانا ضروری ہے۔جب میری باری آئی تو میں نے ان سے کہا کہ اس انداز سے سوچنا صحیح نہیں، بلکہ ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ کوئی شریک ہو یا نہ لیکن کانفرنس کامیاب رہے، نیز جو اصحاب کوئی تجویز اپنے ذہن میں رکھتے ہوں تو وہ کنوینر کے نام بھیج دیں تا کہ وہ لوگ اس پر بات کر لیں۔آپس کا لڑائی جھگڑا کسی وقت چلتا ہو تو چلتا ہو لیکن اب یہ انداز کار بدلنا ضروری ہے۔بہر حال کافی بحث ومباحثہ کے بعد سب حضرات اس پر راضی ہو گئے کہ اگر وہ لوگ کنونشن سے کسی طرح کا تعاون نہ کر سکیں تو کم از کم اس سے اختلاف نہ کریں۔اس زمانے میں 'دعوت' کے سہ روزہ ایڈیشن میں ہم نے کنونشن سے پہلے اہلاً وسہلاً مرحبا کے عنوان سے کچھ ضروری نکات پیش کیے تا کہ شرکائے اجلاس اس پر غور کر سکیں۔اس اجلاس میں ان نکات پر تو غور نہیں ہو سکا لیکن اتنا یاد ہے کہ صدر جلسہ سے لے کر بہت سے شرکا تک نے

مل کر یہی کہا کہ اصل ضرورت ان مسائل پر غور کرنے کی تھی نہ کہ احتجاج کر کے چلے جانے کی۔ کنونشن نے کچھ تجویزیں بھی منظور کیں اور صدر جلسہ کی رائے تھی کہ ان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کوئی کمیٹی بنادی جائے لیکن یہ بات بھی نہیں چل سکی اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم نے کہا کہ جب جمعیۃ علماء موجود ہے تو وہی ان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کافی ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب تھوڑے عرصے کے بعد بیمار ہو گئے اور میرا یہ خیال ہے کہ انھیں اس کا آخر تک افسوس رہا کہ وہ ایک بات طے کر کے اس پر عمل نہ کرا سکے۔ اللہ تعالیٰ جدو جہد اور خلوص کے اس پیکر بزرگ کی مغفرت فرمائے اور ان کو اعلیٰ علیین میں جگہ عنایت کرے۔

مسلمانوں کی مختلف جماعتوں سے اشتراک عمل کی کوششیں ۱۹۴۸ء ہی سے جاری تھیں۔ مولانا آزاد کے کنونشن کے بعد ۱۹۵۰ء میں علی گڑھ میں ایسا ہی ایک اجتماع ہوا، پھر ۱۹۶۱ء میں لیکن ۱۹۶۴ء میں ایک ایسا وقت آیا جس نے ملک کے ہر مسلمان کا دل ہلا دیا اور یہ مشرقی ہند میں آدی باسی بیلٹ میں مسلمانوں کی عظیم تباہ کاری کا واقعہ تھا۔ رانچی اور چائباسہ کے علاقے سے لے کر جمشید پور اور اڑیسہ میں راؤرکیلا اور مضافات میں چند دن کے لیے یہ معلوم ہوتا تھا کہ مسلمان ایک شکار ہیں جن کو شکار کرنے کے لیے ہر شخص ٹوٹا پڑ رہا ہے۔ لوگ جمشید پور کے کارخانے میں دروازے بند کر کے اور لوہے کی چھریاں تیز کر کے وہاں کے مسلمان ملازمین پر ٹوٹ پڑے، رانچی کے میڈیکل کالج میں ساتھی طلبہ نے اپنے ساتھیوں پر یورش کی اور دیہات کا حال تو عجیب ہی تھا، اس واقعہ کے تقریباً ڈیڑھ ماہ کے بعد جب مسلم اکابر مختلف دیہاتوں میں گئے اور وہاں دیواروں پر گوشت کے سوکھے ہوئے چیتھڑے اور ہڈیوں کے سوکھے ہوئے ڈھانچے دیکھے تو کون تھا جو اپنے آنسو ضبط کر سکتا۔

۱۹۶۴ء میں جب مسلم کنونشن کی ضرورت پیدا ہوئی تو اس میں سب سے زیادہ سرگرم حضرات ڈاکٹر سید محمود مرحوم، ملا جان محمد مرحوم، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا ابواللیث صاحب، مفتی عتیق الرحمٰن صاحب، مولانا منظور نعمانی صاحب، حاجی محمد اسمٰعیل صاحب، اور جناب سلیمان سیٹھ صاحب تھے۔ مولانا اسعد مدنی صاحب کو بھی اس میں بہ اصرار داخل کیا گیا۔ یونس سلیم

صاحب دلّی میں نہیں تھے لیکن وہ بھی اس سے دل چسپی لے رہے تھے۔اس طرح کچھ ذمہ دارافراداور ممتاز جماعتوں کے لیڈراس کام میں مصروف ہوگئے کہ یہ اجتماع منعقد ہو۔اس اجتماع کے لیے تقریباً ۲۔ ۳ ماہ تک لوگوں نے کلکتہ، لکھنؤ، اور دلّی کوایک کردیا تھا۔یہی وہ زمانہ تھا جب جمعیۃ علماء کے موجودہ قابض گروہ نے مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے خلاف جواس تنظیم کے ورکنگ صدر تھے، سرگوشیاں شروع کردی تھیں، لیکن یہ واقعات کھل کر سامنے نہیں آئے تھے۔ ادھرعام ملکی سطح پر اکثریتی عوام اور سرکاری سطح پر حکومت اس اجتماع کو پسند نہیں کررہی تھی اور ڈاکٹر محمود صاحب پر یہ ذمہ داری آپڑی تھی کہ وہ اس کے لیے بہتر فضا سازگار کریں۔اس زمانے میں مسٹر لال بہادر شاستری وزیراعظم اور مسٹر (گلزاری لعل) نندا وزیر داخلہ تھے اور دونوں کی یہ خواہش تھی کہ یہ اجتماع نہ ہو۔

۱۹۶۴ء کا دور ۱۹۸۰ء کے دور سے بہت مختلف تھا اور فسادات نے خوف وہراس کے علاوہ ایسی مرعوبیت بھی پیدا کردی تھی جس میں کم از کم مشرقی ہند کے مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ رہے تھے اور باقی علاقوں میں بھی لوگ انتہائی غیر مطمئن نظر آرہے تھے۔لکھنؤ میں ندوۃ العلماء کو کنونشن کا مرکز قرار دیا گیا لیکن توقع نہیں تھی کہ حکومت یہ اجتماع ہونے دے گی۔ مجھے یاد ہے کہ ڈاکٹر محمود صاحب مرحوم اسی زمانے میں مسٹر لال بہادر شاستری سے ملے اور ان سے کہا کہ وہ مسلمانوں کے مسائل پر توجہ کریں۔شاستری جی کی زبان سے اتفاق سے نکل گیا کہ مسلمان کسی بات پر متفق تو ہیں ہی نہیں، اس لیے آخر کیا بات سنی جائے، کس کی بات قبول کی جائے۔ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ پھر تو اس لکھنؤ کنونشن سے آپ کو اتفاق کرنا ہی چاہیے۔ڈاکٹر صاحب نے اس پر شاستری جی سے کہا کہ وہ اسی مضمون کا ایک پیغام دے دیں۔تاہم مرکزی حکومت کے بعد ریاستی حکومت اور اس کے نوکر شاہی کا معاملہ باقی رہ جاتا تھا جسے ڈاکٹر فریدی مرحوم نے اپنے ہاتھ میں لیا۔یوپی کی وزیراعلیٰ سچیتا کرپلانی تھیں جو ڈاکٹر صاحب کی مریضہ اور احسان مند رہی تھیں، فریدی صاحب نے ان کو کنونشن منعقد کرنے کے بارے میں سمجھایا اور یہ مرحلہ بھی آسان ہوگیا۔بعد میں ڈاکٹر صاحب کہتے تھے کہ سچیتا نے ان سے کہا کہ اگر انھیں مسلم مجلس مشاورت کی تشکیل کا علم ہوتا تو ہرگز اجازت نہ دیتیں۔نندا جی جو مرکزی وزیر داخلہ تھے گوسادھو

کہلاتے تھے، لیکن آریہ سماجی ذہنیت میں ڈوبے ہوئے اور اس کنونشن کو ناکام بنانے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔

یہ اجتماع ندوہ میں منعقد ہوا، اجتماع سے پہلے سب لیڈروں نے ایک متفقہ فہرست تیار کی اور اسی کے مطابق لوگوں کو مدعو کیا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ بھوپال کے ایک بڑے مسلمان زعیم جنھوں نے آزادی سے پہلے مولانا آزاد سے تربیت حاصل کی تھی اور بعد میں پارلیمنٹ کے ممبر بھی بن گئے تھے، لکھنؤ تشریف لائے اور خواہش کی کہ وہ اس کنونشن میں شریک ہوں، وہ جب لکھنؤ آئے تو اس وقت ان کی پارلیمنٹ کی ممبری ختم ہو چکی تھی، ذاتی جائداد بھی وہ بے چارے ملت کی خاطر قربان کر چکے تھے۔ اور خدا جانے کس طرح وہ کچھ رقم فراہم کر کے تشریف لائے تھے لیکن فہرست کے سلسلے میں چونکہ سب وعدہ کر چکے تھے کہ کسی کا اضافہ نہیں ہوگا اس لیے بادل ناخواستہ ان سے معذرت کرنی پڑی۔

کنونشن کے سلسلے میں ہر وقت یہ اندیشہ بھی لگا رہتا تھا کہ اگر یہ ناکام ہوا تو مسلمانوں کی مایوسی اور بڑھ جائے گی تاہم حکمت سے تمام کارروائی ہوتی رہی۔ یہ بھی طے ہوا کہ مسلم تنظیموں اور ذمہ دار افراد کی ایک مجلس مشاورت بنائی جائے۔ متاثرہ علاقوں کا تمام لیڈر ایک ساتھ دورہ کریں تاکہ مسلمانوں پر یہ تاثر قائم ہو کہ وہ اکیلے نہیں ہیں اور ان کے سب رہنما ایک جان ہو کر آگے بڑھنے کے لیے آمادہ ہیں۔ یہ بھی خیال ہوا کہ یہ اتحاد مرکزی سطح سے اتر کر ریاستی اور ضلع اور تحصیل کی سطح تک پیدا ہو لیکن مولانا اسعد مدنی کا اصرار تھا کہ صرف مرکزی سطح تک ورنہ زیادہ سے زیادہ ریاستی سطح تک اسے لے جایا جائے اور اس سے نیچے نہ پھیلے۔

کنونشن میں بعض حضرات مدعو ہوئے بغیر کسی طرح گھس آئے تھے اور اسی طرح ایک جماعت کے ایک دو مغلوب الغضب آدمی تھے جن کی وجہ سے بار بار یہ اندیشہ لاحق ہوتا تھا کہ کہیں کچھ لوگ اٹھ کر نہ چلے جائیں اور کنونشن کے ناکام ہونے کا بلند بانگ اعلان کر دیں۔ مغربی بنگال کے ایک کاظم علی مرزا نے یہ خدمت انجام بھی دی۔

ادھر ندوہ کے سیکڑوں طلبہ کنونشن کے لوگوں کی خدمت تو کر ہی رہے تھے لیکن ان کی ایک بڑی تعداد اجتماعی طور پر ہمہ وقت دعاؤں میں مصروف تھی کہ یہ کنونشن کامیاب ہو، کنونشن میں

جمشید پور، رانچی اور راور کیلا اور دوسرے متاثرہ علاقوں کے ذمہ دار اصحاب بھی شریک تھے۔ اور رورو کر اپنی ملت کی بےبسی کا حال بیان کر رہے تھے کہ جس کو سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے لیکن بار بار بعض لیڈروں کی وجہ سے انتشار کا اندیشہ تھا۔ شاید ایسا ہی کوئی لمحہ تھا جب مولانا علی میاں ندوی جن کو آنکھ کی تکلیف کی وجہ سے تقریر کی سخت ممانعت تھی، بے چین ہو کر کھڑے ہوئے اور گویا اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہا کہ اب آپ سب حضرات یہاں سے اس وقت تک نہیں جائیں گے جب تک کہ باہم متحد ہو کر کوئی اجتماعی شکل نہ دے لیں۔

(ہفت روزہ دعوت، دہلی، ۴؍مئی ۱۹۸۰ء)

❐❖❐

کنونشن کے بعد میں

بات لکھنؤ کنونشن کی ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر سید محمود صاحب مرحوم نے اپنے خطبۂ صدارت میں مسلمانوں سے کہا تھا کہ وہ اپنے دکھ درد کی کسک کو محسوس کرنے والے ہی نہیں بلکہ انسانیت کے غم میں گھلنے والے بھی ہیں، وہ ایک چشمۂ صافی ہیں جس کے صاف شفاف پانی سے سیرابی کا ہر ایک کو حق ہے۔ اور مسلمانوں کو اپنا مقام پہچاننا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب بہ ظاہر ایک انگریزی تعلیم یافتہ انسان تھے لیکن اسلامی علوم اور تاریخ کا ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور اللہ نے ان کو ایسا گداز دل بھی عطا کیا تھا کہ وہ اپنا خاصا وقت خدا کے نیک بندوں کے پاس بیٹھنے اور ان سے استفادہ کرنے میں گزارتے تھے۔ ان کو دیکھ کر کوئی یہ سمجھ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ شب بیدار اور تہجد و اشراق تک کی نمازوں کے انتہائی پابند ہیں۔ اپنے اسی خطبے میں ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ مسلمان نیک اور سادہ ہیں اور اپنی اجتماعیت کے آرزومند، اس لیے اگر ان کے رہنما اکٹھا ہو کر آگے نہ بڑھ سکے تو خدا اور خلق دونوں کے سامنے اس کی پرسش ہوگی۔

لکھنؤ کا یہ اجتماع بڑی کڑی منزلوں سے گزر کر بالآخر کامیابی پر ختم ہوا اور یہ طے کیا گیا کہ تمام مسلم تنظیموں کے نمائندے نیز دوسرے ناوابستہ اہم مسلمان اس میں شریک ہوں اور مسلم مجلس مشاورت کے نام سے مشترکہ امور میں اپنی اجتماعی کوششوں کو آگے بڑھائیں۔ کنونشن میں کئی تجویزیں منظور ہوئیں لیکن اس کی اہم ترین تجویز یہ تھی کہ اس ملک کی اکثریت اگر ملک کو محبت و اعتماد عطا نہیں کر سکی ہے تو یہ قرض مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے کہ وہ ملک میں باہمی خوش اعتمادی اور محبت پیدا کریں۔

کنونشن کے اگلے پروگرام کے سلسلے میں ملّا جان محمد صاحب مرحوم نے ایک تجویز پیش کی کہ سب مسلمان لیڈر ایک ساتھ مل کر ان علاقوں میں چلیں جہاں کے مسلمان سب سے زیادہ فسادات کا شکار ہوئے ہیں اور ان کو ڈھارس دیں۔ اس دورے کا پروگرام بن گیا اور رانچی سے اس کا آغاز ہوا۔ دورے میں جن لوگوں کو جانا تھا ان میں ڈاکٹر سید محمود صاحب کے علاوہ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب، مولانا اسعد مدنی صاحب، مولانا ابواللیث صاحب، مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب، مولانا منظور نعمانی صاحب، ملّا جان محمد صاحب، محمد اسمٰعیل صاحب، سلیمان سیٹھ صاحب اور یہ خاک سار شامل تھے۔

لکھنؤ سے خود اعتمادی کی اس فضا کے ساتھ ابھی لوگ واپس ہی ہوئے تھے کہ اچانک یہ خبر شائع ہوئی کہ دلی میں ایک جمہوری کنونشن منعقد کیا جارہا ہے جس کے داعی مولانا سید اسعد مدنی صاحب ہیں۔ غالباً ۱۰، ۱۵ دن کے اندر اندر یہ کنونشن ہو بھی گیا۔ مسٹر مرارجی ڈیسائی (اس وقت کے وزیر خزانہ) اس کے اہم مقرر تھے۔ ڈیسائی صاحب نے اپنی تقریر میں لکھنؤ کے مسلم کنونشن پر شدید اعتراضات کیے اور اسے فرقہ پرست بتایا۔ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب بھی اس میں شریک تھے۔ انہوں ڈیسائی صاحب کی تقریر کے بعد تقریر کی اور کہا کہ ملک میں جو کچھ ہورہا ہے اس کی فرقہ پرستی پر ڈیسائی صاحب کی نظر نہیں جاتی لیکن مسلمان ایک جگہ بیٹھ کر رو بھی لیتے ہیں تو وہ بات سب کو کھٹک رہی ہے۔ ڈیسائی صاحب بھی منہ پھٹ آدمی ٹھہرے فوراً ہی بڑی درشتی سے بولے کہ وہ ایسی باتیں سننے کے عادی نہیں۔ مفتی صاحب بہت بامروت بزرگ ہیں مگر اس وقت غصے میں اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ آپ کیا راجہ ہیں کہ آپ کی غلط بات پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔ مرارجی ڈیسائی بھی غصے میں کھڑے ہوگئے لیکن بیرسٹر نورالدین صاحب مرحوم نے بیچ بچاؤ کردیا۔ تاہم اسی وقت اندازہ ہوگیا کہ حکومت کا رخ کیا ہے۔

۹/اگست کو مسلم مجلس مشاورت کی بنیاد پڑی اور اکتوبر میں اس دورے کا آغاز تھا۔ اس میں مولانا اسعد مدنی صاحب کے علاوہ سب لوگ شریک ہوئے۔ رانچی جہاں سے مشرقی ہند کے سفر کا آغاز ہورہا تھا وہاں بھی یہ ہوا کہ ایک خاص مدرسے کے بزرگ جن کو شیخ الاسلام مولانا مدنی سے بیعت کا شرف بھی حاصل تھا وہ اور ان کے ساتھی اساتذہ مجلس استقبالیہ اور ساری سرگرمیوں

سے دور رہے۔ باقی پورا رانچی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وارفتہ وار نکل آیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس دورے میں یہ پروگرام بنایا تھا کہ وہ جلسوں اور ملاقاتوں کے علاوہ ہر مقامی پارٹی کے دفتر جاتے تھے خواہ وہ سوشلسٹ اور کمیونسٹ ہوں یا آر ایس ایس اور جن سنگھ یا کانگریس وغیرہ۔ ان کا کہنا تھا کہ محبت کا پیغام پہنچانے والوں کو چاہیے کہ سب کے سامنے اپنا پیام محبت پیش کریں۔

رانچی میں مولانا انیس الدین احمد صاحب مرحوم، مولانا احمد علی قاسمی صاحب، عبدالمغنی صاحب، مولانا انیس الرحمٰن صاحب اور دوسرے ذمہ دار حضرات ان سب مہمانوں کی تشریف آوری کے لیے ایک مجلس استقبالیہ بنا چکے تھے۔ ان مہمانوں کا خیال تھا کہ وہ ایک فساد زدہ اور اجڑے ہوئے علاقے میں جا رہے ہیں اس لیے نہ جانے ان کے قیام کا بھی کوئی معقول بندوبست ہو یا نہ ہو۔ لیکن رانچی اسٹیشن پر آ کر ان کی حیرت کی انتہا نہیں رہی۔ اسٹیشن سے قیام گاہ تک پورے راستے پر انسان قطار در قطار صف بستہ کھڑے تھے اور پورا شہر دروازوں اور محرابوں سے مزین تھا۔ میں نے دیکھا کہ مولانا ابواللیث صاحب، مولانا علی میاں اور مولانا منظور نعمانی ایک گاڑی میں بیٹھے تھے اور تینوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

رات کو ایک بڑے میدان میں جلسہ ہوا جس میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ پوری بستی امنڈ آئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سے پہلے ہی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے کہلوا دیا تھا کہ جلسے کا انتظام کرنے کے لیے پولیس ہرگز تعینات نہ کی جائے۔ چناں چہ وہ شہر جہاں مسلمان ہندوؤں کے اور ہندو مسلمانوں کے محلوں سے گزرتے ہوئے ڈرتے تھے اور ہر ایک دوسرے سے خوف زدہ تھا وہیں جلسۂ عام میں ہندو اور مسلمان شانہ بشانہ بیٹھے تھے۔ ملاقاتوں میں وہاں کے غیر مسلموں نے اصرار کر کر کے اپنے یہاں بلایا اور صاف دلی سے اعتراف کیا کہ فرقہ وارانہ فسادات کے موقع پر انسان انسانیت کے درجے سے گر گئے تھے۔ یہ اعتراف اور یہ محبت وہ پہلا کرشمہ تھا جس کا اس دورے میں اظہار ہوا۔ اور یہی ہم سب کی دلی خواہش بھی تھی کہ لوگوں کے دل بدلتے جائیں۔

(ہفت روزہ دعوت، دہلی، ۱۸رمئی ۱۹۸۰ء)

□❖□

ذکر پنڈت نہرو کا

پنڈت جواہر لال نہرو ذی شعور انسان تھے، عمر کے ہر حصے میں ان کا نئی کتابیں دیکھنے کا مشغلہ جاری رہا، عملی قیادت اور مطالعہ میں اکثر کوئی جوڑ نہیں ہوتا لیکن وہ ان چند مستثنیات میں سے تھے جو عملی سیاست میں بھی بھر پور حصہ لیتے تھے اور مطالعہ کا شغف بھی جاری تھا۔

۱۹۴۷ء کے بعد انھوں نے اپنی انتظامیہ، اپنے اکثریتی عوام اور خود اپنی کابینہ کے ممتاز افراد کے خلاف مسلمانانِ ہند کے لیے ایک بڑے سہارے کا کام کیا لیکن یہ روایت ان کے ایک قریبی دوست ڈاکٹر سید محمود صاحب نے بیان کی ہے کہ وہ ۱۹۵۲ء کے بعد مسلمانوں کے سلسلے میں کچھ بجھ بجھ سے گئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب 'ریلیجئس لیڈر' (مذہبی قائد) نام کی ایک کتاب چھپی تھی۔ مسٹر کے ایم منشی نے اس کا دیباچہ لکھا تھا، اس کتاب میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور دین اسلام کے لیے تضحیک کا پہلو نکلتا تھا۔ اس پر ہندستان بھر کے مسلمانوں میں فطری طور پر ایک بے چینی پیدا ہوگئی اور اس بے چینی نے تشدد کی شکل اختیار کر لی۔ پنڈت نہرو کی خواہش تھی کہ ایک تحقیقی کتاب کا جواب تحقیقی انداز میں دیا جائے تا کہ مضمون لکھنے والے نے اگر غلط فہمی کی بنا پر وہ مضمون لکھا ہے تو وہ غلط فہمی دور ہو سکے اور اگر اس میں اس کی بدنیتی شامل ہے تو یہ بات بھی کھل کر سامنے آسکے۔

اب سے بہت پہلے کی بات ہے ایک مستشرق نے اسلام کے سلسلے میں بے سروپا الزامات لگائے اور ان ہی الزامات کو برطانوی انسائیکلو پیڈیا نے بھی قبول کر لیا۔ سر سید احمد خاں مرحوم زندہ تھے، انھوں نے مغربی عوام کے ذہن کو سدھارنے کے لیے لندن کا سفر کیا اور سیرت و

مذہب پر مضامین لکھے۔ خود انسائیکلو پیڈیا کے ذمہ داروں کو خط لکھا اور انھوں نے بھی آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح کا اعلان کیا۔ جواہر لال بھی اسی ماحول میں پلے اور بڑھے تھے، اس لیے وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ کوئی تحقیق اگر غلط ہے تو اسے دلائل کے ساتھ رد کیا جائے۔

جذبات واحساسات کس میں نہیں ہیں اور اگر کوئی دل اس سے عاری ہو تو وہ انسان نہیں، پتھر ہے۔ البتہ سوال یہ ہے کہ جن عوام تک ایسی کوئی غلط بات پہنچی ہے تو ان کی غلط فہمیوں کو کیسے دور کیا جائے۔

امریکہ کے سماج میں کتابیں شائع کرنے کا ایک خاص رواج ہے۔ ایک نے اگر دوسروں کے بارے میں غلط کتاب لکھ دی تو چند دن کے بعد ہی اس کی تردید میں دوسری کتاب شائع ہو جاتی ہے اور وہ بھی ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہے۔ اس طرح علمی وتحقیقی امور کا معاملہ صرف اصحاب مطالعہ تک محدود رہتا ہے، تاہم اس کے بعد بھی کوئی اپنی غلطی پر مصر ہو تو اس کے خلاف تحریک چلانا ضروری ہوسکتا ہے بشرطیکہ اس کی باگ ڈور بھی اہل علم کے ہاتھ میں ہو۔ ہماری عوام میں بلاشبہ حمیت دینی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے لیکن اس کے اظہار کے طریقے میں سنجیدگی اور متانت کے بجائے ایسے مظاہرے ہونے لگے جن سے خود ہمارے دینی مقام کو ٹھیس لگے تو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوگی۔ یہ صحیح ہے کہ ہم ہندستان میں گیارہ بارہ صدیوں سے رہ رہے ہیں لیکن ہمارا ملکی ماحول ہم سے اجنبی ہے۔ زبان کی دوری نے بھی اس اجنبیت کو بڑھا دیا ہے۔ اس لیے یہ خیال کرنا زیادہ صحیح ہے کہ ان اجنبیوں کی غلط فہمی کو دور کرنا اور صحیح حالات سے روشناس کرانا ہمارا اپنا کام ہے جس میں، ہم کو صبر اور مستقل مزاجی سے اپنا کام کرتے رہنا ہے اور ایسی صورت پیدا کر دینا ہے کہ غلط فہمی کا کوئی موقع نہ رہنے پائے اور اگر کوئی اپنی رائے پر اصرار کر رہا ہو تو ہر منصف مزاج آدمی یہ سمجھ سکے کہ دوسرے لوگ دھاندلی برت رہے ہیں۔

(ہفت روزہ دعوت، دہلی، ۱۵/جون ۱۹۸۰ء)

□❖□

کیرلا کے دو سفر

کیرلا کی ریاست میں ابھی ۴-۵ سال ہوئے جانا ہوا۔ بنگلور میں جماعت اسلامی کی (مرکزی) مجلس شوریٰ کا اجلاس تھا وہیں سے ہم دو تین اصحاب کو خیال ہوا کہ کیرلا کے جماعتی مراکز اور دوسرے تعلیمی اداروں کا جائزہ لیا جائے۔ رفقائے جماعت نے ایک دو جگہ تقریروں کا بھی پروگرام رکھ دیا تھا، تاہم اس دوروزہ دورے سے کوئی تسکین نہیں ہوئی، میسور سے کالی کٹ آتے ہوئے کچھ مدارس دیکھے اور انہیں دیکھ کر خوشی بھی ہوئی۔ جماعت اسلامی کے رفقا ایک جگہ سائنس کا ڈگری کالج چلا رہے ہیں۔ اس کی کارگزاریوں کو دیکھ کر حوصلہ بھی بڑھا کہ دینی علوم کے ساتھ مسلمان عصری علوم پر بھی توجہ کرر ہے ہیں۔ وہاں کے طلبا کا ریکارڈ بھی اچھا ہے۔ اس کے علاوہ کئی چھوٹے چھوٹے دیہات بھی جانے کا اتفاق ہوا اور یہ اندازہ کر کے خوشی ہوئی کہ ہر جگہ جماعت کے رفقا نے تعلیم وتربیت کے مراکز کھول رکھے ہیں اور انہی تعمیری کاموں کی طرف ان کی بیش تر توجہ مرکوز ہے۔

کیرلا میرے لیے نیا نہیں تھا۔ ۱۹۴۷ء سے بہت پہلے ۱۹۴۲ء میں اس علاقے میں دو ماہ تک رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ آج تو اردو بولنے سمجھنے والے ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں لیکن اس زمانے میں پورے کالی کٹ میں شاید سات آٹھ افراد کے علاوہ کوئی اردو جانتا ہی نہیں تھا یہی حال مالابار کے دوسرے علاقوں میں بھی تھا۔ غالباً بلکہ یقیناً اردو کی ترویج و اشاعت ۱۹۴۷ء کے بعد کا کارنامہ ہے اور مسلمانوں نے صرف اس خیال سے اس زبان کو ترویج دی کہ انہیں مذہبی لٹریچر کی ضرورت تھی اور یہ لٹریچر اردو زبان ہی میں کثرت سے مل سکتا ہے۔

۱۹۴۲ء کی باتیں اور مالابار کا دورہ اب تک ذہن میں ہے۔ مدراس سے کالی کٹ جاتے ہوئے جیب میں کل ۴۰، ۴۲ روپے تھے اور اسی میں دو ماہ وہاں اپنا گزارا کرنا تھا۔ میرا تعلق اس وقت خاک سار تحریک سے تھا۔ علامہ مشرقی مدراس میں نظر بند تھے اور انہی کی یہ خواہش تھی کہ مختلف علاقوں سے کچھ لوگ جا کر جنوبی ہند میں پھیل جائیں۔ بھوپال سے ہم دو اشخاص اس کام کے لیے تیار ہوئے۔ ایک میں اور ایک اور صاحب۔ وہ ساوار میں چائے بنا کر بازار میں بیچتے تھے وہی ساوار اور کچھ چائے اور چینی لے کر ریل میں سوار ہو گئے۔ راستے بھر ان کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ ان کو ویلور گدیا ئم میل دشارم وغیرہ کے علاقے میں لگا یا گیا اور وہاں بھی یہی ان کا ذریعہ روزگار تھا۔ خاک سار تحریک میں تین دن سے زیادہ کسی کا مہمان نہیں بنا جا سکتا تھا بلکہ ہدایت تھی کہ لوگ اپنا کمائیں اور تحریک کا کام کریں۔ میں مالابار کے علاقے میں متعین کیا گیا جہاں کے ایک بڑے اور ہمدرد تاجر کے یہاں مجھے قیام پذیر ہونا تھا۔ ان بے چاروں نے کہیں دور دراز سے گیہوں کا آٹا منگوا کر رکھا تاکہ میری ضیافت ہوتی رہے لیکن تین دن کے بعد ان سے معذرت کر لی لیکن یہ بات ان کے آداب میزبانی کے خلاف تھی، وہ صبح ہی صبح بھاری ناشتہ تیار کراتے اور اپنے پاس لے بیٹھتے تھے ادھر مجھے اس تکلیف دہی پر بڑی تکلیف ہوتی تھی چناں چہ میں نے نفلی روزے رکھنا شروع کر دیئے جس کے بعد وہ مجبور ہو جاتے تھے۔ دن بھر میں تحریک کا تعارف کرواتا، شام کو کسی ہوٹل میں کھانا کھا لیتا۔ چند دن کے بعد طبیعت اس کھانے کی بھی متحمل نہیں رہی۔ مجھے یاد ہے کہ اس زمانے میں وہاں کیلے بہت سستے تھے۔ بڑے بڑے کیلے ایک آنے یا دو آنے کے سولہ مل جاتے تھے۔ اس لیے کہ روزہ کھولنے کے بعد کیلے کھا کر کام چل جاتا تھا لیکن اِدھر اُدھر جانے میں خاصے مصارف ہونے لگے تھے اور یہ نوبت آ گئی تھی کہ جیب میں شاید دو تین روپے ہی رہ گئے تھے جب کہ قیام کی مدت میں ایک ماہ باقی تھا چناں چہ ایک دور دراز محلے میں جا کر مزدوری شروع کی۔ کچھ اور کام تو آتا نہیں تھا صرف اینٹیں اٹھا کر اوپر لے جانا پڑتا تھا اور شاید ایک روپے دس آنے مزدوری کے ملتے تھے۔ شدہ شدہ یہ خبر شہر کے اور سرکردہ اصحاب کو پہنچ گئی۔ ان ہی میں مسلم لیگ کے عبدالرحمٰن بافقیہ صاحب بھی تھے۔ ان سے نظریاتی اختلاف ضرور تھا لیکن تعلقات میں خوش گواری بھی تھی۔ انہوں نے اصرار کر کے

سیاہ مرچ کے کچھ بورے میرے نام سے کہیں بھیجے اور اس کا نفع مجھے دیا۔ ہم لوگوں کی اس رضا کارانہ محنت کا اثر مسلم لیگ کے لیڈروں نے بھی قبول کیا بلکہ وہ اکثر اپنے جلسوں میں اس کا تعارف بھی کراتے تھے۔

محنت مزدوری کرنے اور پھر کاز کی خدمت کرنے میں جو لذت مجھے حاصل ہوئی تھی اس طرح کی لذت کو اب تک جی ترستا ہے اور شاید مسلمان بھی اس کے لیے ترستے رہتے ہیں۔ انجمنیں، تنظیمیں، کارکن، اعانتیں ان میں سے کسی کی کمی نہیں لیکن یہ روایتیں ابھی مفقود ہیں کہ سخت سے سخت حالات کا بھی مقابلہ کرتے ہوئے مسلمان کارکن یہ کہہ سکیں کہ خدا کی زمین ان کے لیے تنگ نہیں ہے اور وہ کسی سہارے کے بغیر انفرادی طور پر بھی کیمپ لائف کی زندگی گزار سکتے ہیں۔ دنیا کی مختلف تحریکات میں کچھ باتیں خوبی کی ہوتی ہیں اور ان سے ایک دوسرے کو سبق لینا ہی چاہیے۔

(ہفت روزہ دعوت، دہلی، ۲۲/جون ۱۹۸۰ء)

❐❖❐

صحیح راستہ

مدھیہ پردیش کے امیر حلقہ انعام الرحمٰن صاحب بھوپال سے کچھ دور ایک علاقے میں کاشت کار ہیں۔ وہاں تقریباً سب کے سب غیر مسلم ہیں لیکن کسی شخص کو ان سے کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی بلکہ اس کے برعکس وہ اپنے اور آس پاس کے لوگوں کے گھریلو مسائل اُن کے سامنے اس اعتماد کے ساتھ لاتے ہیں کہ اب قوت فیصلہ صحیح ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے۔ انعام صاحب نے غیر مسلموں کو اسلام سے روشناس کرانے کی کوششوں میں بھی کبھی کوئی مداہنت نہیں برتی اور ان کی سرگرمیوں سے پورا علاقہ واقف ہے۔

انعام صاحب کی بات اس وقت ایک پرانے واقعہ کے سلسلے میں یاد آ گئی۔ یہ ۱۹۵۰ء کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں جن سنگھ کا وجود عمل میں نہیں آیا تھا بلکہ صرف ہندو مہا سبھا ہی ہندو کاز کی اصل محافظ تھی۔ اس زمانے میں انعام صاحب اور جماعت اسلامی کے بہت سے کارکنوں کو حکومت نے گرفتار کرلیا اور نظر بندی کے قانون کے تحت انھیں جیل میں ڈال دیا۔

ایک صاحب شنکر دیال شریواستو اس زمانے میں مہا سبھا کے صدر تھے اور انعام صاحب کے قریبی صدر مقام میں وکالت کرتے تھے۔ جماعت اسلامی کے کارکنوں کی گرفتاری کے اسباب یہی بتائے گئے تھے کہ یہ فرقہ پرست ہیں۔ الزام بھی عجیب وغریب تھا۔ ایک مسجد میں جماعت اسلامی کا ہفتہ وار اجتماع ہوتا تھا۔ اتفاق سے ایک ہفتہ جو اجتماع ہو رہا تھا وہی ہولی کا آخری دن تھا اور شہر میں بڑی ہلڑ بازی تھی۔ رنگ پھینکنے کا اتنا زور تھا کہ کسی کا گھر سے نکلنا مشکل تھا۔ پولیس مجسٹریٹ سب کے سب گلال اور رنگ پھینکنے میں مصروف تھے۔ شام کے اجتماع میں امیر جماعت اسلامی بھوپال نے تقریر کے دوران ایک ادبی لطیفہ کے طور پر کہہ دیا کہ لوگ رنگ پھینک رہے ہیں لیکن ہمارا بھی ایک رنگ ہے: صبغة الله ومن احسن من الله صبغه ”اللہ کا رنگ اور اس

سے اچھا کس کا رنگ ہوسکتا ہے۔'' سی-آئی-ڈی والے تو جیسے اَن پڑھ ہوتے ہیں وہ سب کو معلوم ہے۔اس نے صبغۃ اللہ کو نہ جانے کس طرح یاد رکھا ہوگا باہر جا کر کسی سے اس کے معنی پوچھے تو اس نے کہا کہ اس کا مطلب ''خون'' سے ہے۔ چناں چہ یہ کہانی تیار ہوگئی کہ جماعت اسلامی کے اجتماع میں خون کی ہولی کھیلنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔اسی رات میں جماعت اسلامی کے سب کارکنوں کو گرفتار کرلیا گیا اور اخباروں میں یہ خبریں آ گئیں کہ ان حضرات کو فرقہ پرستی کے الزام میں پکڑا گیا ہے۔

کہنے کی بات یہ ہے کہ مہا سبھا کے صدر شنکر دیال صاحب نے یہ خبر سنتے ہی ایک بیان دیا کہ سورج کو اگر کوئی تاریک کہہ دے تو میں ایک وقت اس پر یقین کرسکتا ہوں لیکن انعام صاحب کو فرقہ پرست کہنے پر یقین نہیں کرسکتا۔

وہ زمانہ مسلمانوں کے لیے بڑا سخت تھا۔ مدھیہ پردیش میں مہا سبھا کا زور تھا اور وہ چاہتی تھی کہ بھوپال شہر میں بھی اپنا زور واثر پھیلائے۔ چناں چہ اس غرض کے لیے بھوپال میں اس نے ایک آل انڈیا کانفرنس منعقد کی جس میں ماسٹر تارا سنگھ وغیرہ کو بھی مدعو کیا گیا۔اتفاق ایسا تھا کہ ان ہی دنوں تبلیغی جماعت کا بھی ایک اجتماع بھوپال میں ہونے والا تھا اور عام طور سے یہ غلط فہمی پائی جاتی تھی کہ شہر میں کسی وقت بھی کوئی گڑبڑ ہوسکتی ہے۔تبلیغی جماعت نے اپنے کارکنوں کو شہر میں گشت لگانے سے منع کردیا تھا اور اس سے بھی لوگوں میں خوف وہراس پیدا ہونے لگا تھا۔جس محلے کے قریب مہا سبھا کا اجلاس ہونے والا تھا وہاں کے بیش تر مسلمان کسی خطرے کے ڈر سے دوسرے محلوں میں چلے گئے تھے۔ جماعت اسلامی نے مہا سبھا کے اجلاس میں استقبالیہ کمیٹی سے اپنے بک اسٹال کے لیے ایک جگہ ریزرو کرا رکھی تھی لیکن جوں جوں باہر کے مہا سبھائی رضا کار آتے گئے اس اسٹال کا تصور لوگوں کو کھٹکتا چلا گیا اور استقبالیہ پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ اسلامی اسٹال کو نہ لگنے دے۔ ادھر استقبالیہ کے ممبر چونکہ شہر ہی کے تھے اور ایک دوسرے سے پوری طرح واقف بھی، اس لیے انہوں نے کہا کہ وہ استقبالیہ کی رکنیت اور عہدے چھوڑ سکتے ہیں لیکن جو وعدہ کرچکے ہیں اس کا ایفا کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

بہرحال ایک خراب وخستہ جگہ بک اسٹال کو دے دی گئی لیکن ہم نے وہاں پر کچھ مٹی بچھا کر رائی کے بیج بو دیے جو تین چار دن ہی میں پھوٹ آتے ہیں۔ کچھ گملے وغیرہ بھی منگوا کر رکھ

دیے اور اس طرح ظاہری لحاظ سے بھی یہ اسٹال دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہی خوب صورت ہو گیا۔ اسٹال کے سامنے ایک درخت بھی تھا اور اس درخت کی وجہ سے کوئی اور دکان دار اسے لینے کے لیے تیار نہیں تھا، ہم نے اس درخت پر بڑے بڑے کتبے لگا کر اسے دیدہ زیب بنالیا۔ بھوپال تو جرأت مندوں کی بستی ہے جب ہم وہاں کتابیں جمار ہے تھے تو ایک پرانے بزرگ تشریف لائے اور علیحدہ لے جا کر کہا کہ تم لوگوں کی جان کو ہر وقت خطرہ ہے، اس لیے تمہارے لیے میں ایک ریوالور لے آیا ہوں اسے تم رکھ لو۔ اللہ تعالیٰ ان صاحب کی مغفرت فرمائے۔ دینی لحاظ سے یہ کوئی ممتاز حیثیت نہیں رکھتے تھے لیکن ملی حمیت اور اخوت کی وجہ سے وہ اس پیش کش کے علاوہ خود بھی پہرہ دینے کے لیے تیار تھے۔ بہر حال بڑی نرمی سے ان کی پیش کش کو واپس کیا گیا اور یہی کہا گیا کہ اگر اس راہ میں کوئی تکلیف بھی پہنچے تو یہ اجر ہی کا باعث ہے۔

لوگوں کا اندازہ تھا اور خود ہمارا بھی کہ مہا سبھا کے اس بڑے اجلاس میں سب سے زیادہ رونق جماعت اسلامی ہی کے اسٹال پر تھی۔ لوگ صبح سے رات کو دو بجے تک وہاں آتے رہتے، کتابیں پڑھتے اور تبادلہ خیال کرتے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جو تصور لے کر آتے تھے جاتے وقت وہ بدلا ہوا ہوتا تھا۔ اس اسٹال پر ماسٹر تارا سنگھ اور این سی چٹر جی بھی آئے اور اسلامی موضوعات پر اپنے ذہنی اشکالات پیش کیے جس کو ہم نے اپنے مطالعہ کے لحاظ سے رفع بھی کرنا چاہا۔ ادھر شہر میں اس اسٹال کی وجہ سے یہ فضا پیدا ہوگئی کہ آس پاس کے لوگ جو بھاگ گئے تھے واپس اپنے گھروں میں آ گئے اور خود اس اجلاس میں مسلمانوں نے کثرت سے شرکت شروع کر دی۔ ظاہر ہے کہ مہا سبھا کے مقرروں کی تقریروں کا اثر مسلمانوں پر تو کیا پڑتا، الٹا ان پر یہ اثر پڑنے لگا کہ وہ اپنے اشتعال انگیز لہجے کو بدلیں۔

ایک ملک جس میں مختلف لوگ رہتے ہیں، وہاں کے عوام سے علیحدہ رہنا بھی صحیح نہیں اور ان کا تابع بن کر چلنا بھی غلط ہے بلکہ صحیح راستہ یہ ہے کہ ان عوام سے قریبی ربط بھی ہو اور ان تک اسلامی کی دعوت بھی پہنچائی جاتی رہے۔

(ہفت روزہ دعوت، دہلی، ۲۹؍جون ۱۹۸۰ء)

□❖□

مزدوری کی برکت

ایک بار ایک معزز آدمی جن کو روزگار سے محروم کر دیا گیا تھا، تشریف لائے اور اطلاع دی کہ وہ دو تین دن میں پاکستان جانا چاہتے ہیں۔ ۱۹۴۹ء کا زمانہ تھا۔ راجستھان کے راستے کھوکھرا پار سے لوگ برابر جا رہے تھے۔ دوسرے بعض علاقوں میں پاسپورٹ کے بجائے پرمٹ کا رواج چل پڑا تھا۔ لیکن کھوکھرا پار ابھی اس زد سے بچا ہوا تھا، اور لوگ یہیں سے آسانی سے چلے جاتے تھے۔

یہ صاحب نوجوان تھے اور کسی محکمے میں ملازم تھے، لیکن ایک متعصب چیف کمشنر نے آ کر تخفیف شروع کر رکھی تھی اور اس محکمے کو پورے کا پورا ختم کر دیا تھا۔ مرکزی سرکار کا حکم یہ تھا کہ کوئی آدمی کسی محکمے سے تخفیف کیا جائے تو اسے دوسری جگہ ملازمت دی جائے لیکن اس زمانے میں کوئی پوچھنے والا بھی نہیں تھا کہ سرکاری مشینری کیا کر رہی ہے۔

ہم لوگ اپنے علاقے کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اس لیے پورے یقین کے ساتھ ان سے کہا کہ وہ بھی نہ جائیں، وہ بولے پھر کریں کیا؟ ہم نے اپنے زمانے کا معروف جملہ ان کے سامنے دہرا دیا کہ آخر محنت مزدوری تو کر سکتے ہیں، پھر یہی راستہ اختیار کیجیے۔ بعض صحابہ کرام اور بڑے لوگوں کے واقعات بھی ان کو سنائے کہ جب ان بزرگوں نے ایک ایک کھجور معاوضہ لے کر ایک ایک ڈول کھینچا ہے تو آپ کیوں اس سے گریز کرتے ہیں۔ ان صاحب نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہا کہ آپ کی بات اچھی سہی لیکن یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔

بات اس وقت تو آئی گئی ہوئی لیکن ان کی یہ بات دل میں چبھ گئی کہ نصیحت کرنے والا

اگر خود اس پر عامل نہ ہو تو اس کی بات میں کوئی اثر نہیں رہتا۔ شاہ فرید الدین گنج شکر کی یہ بات بھی یاد آ گئی کہ انھوں نے کسی معتقد کے بچے کو جو گڑ زیادہ کھاتا تھا اور جو دعا کرانے آیا تھا کہ یہ عادت چھوٹ جائے، ایک ہفتے بعد آنے کے لیے کہا اور پھر ہفتے بھر کے بعد دعا کی۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ وہ خود گڑ کھایا کرتے تھے۔ ہاں جب انھوں نے گڑ چھوڑ دیا تو دعا کی اور اس میں ایک ہفتے کی مہلت لگی۔

ان صاحب کے جانے کے بعد ہم دو چار احباب جمع ہوئے اور سوچا کہ لوگ فاقہ کشی کی وجہ سے بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ اور ہم صرف بیانات دے کر اور مقالے لکھ کر انھیں روک رہے ہیں، یہ بات ٹھیک نہیں ہے، ہمیں ان لوگوں میں خود اعتمادی اور اپنی روزی آپ کمانے کی عادت ڈالنے کے لیے اُن کو اپنے ساتھ لے چل کر ان کا حجاب بھی دور کرانا چاہیے۔

ہمیں زندگی کے کاروباری تجربات نہیں تھے، اس لیے آسان صورت یہی سمجھی کہ چار پانچ کلہاڑیاں اکٹھی کی جائیں اور قریب کے جنگل سے لکڑی کاٹ کر بازار میں بیچی جائے۔ چناں چہ یہ انتظام کر کے ہم ان صاحب اور ان کے ایک ساتھی کے پاس جو پا بہ رکاب تھے، پہنچے اور کہا کہ ہم آپ صبح لکڑی کاٹنے چلیں گے اور اللہ نے چاہا تو اس کام میں برکت نصیب ہوگی۔ جوانی اُن دونوں اصحاب کی بھی تھی اور ہم تین افراد بھی جوان کو ساتھ لے جا رہے تھے وہ بھی صحت مند تھے، جنگل جا کر ہم نے دوپہر تک کافی لکڑیاں جمع کیں اور کچھ کاٹیں، انھیں لاد کر شام کو چار پانچ بجے شہر پہنچے۔ یہ بڑے بڑے گٹھے ہم میں سے کسی نے کبھی نہیں اٹھائے تھے اس لیے ایک دو میل چل کر ہانپنے لگے۔ ہمارے سر کی حالت یہ تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ گردن میں دھنسا جا رہا ہے۔ بہرحال شہر میں بازار کے پاس ایک بڑے میدان میں انھیں لا پٹکا۔ ہمارے کہے بغیر شہر میں اس واقعہ کی شہرت ہو چکی تھی، اور کافی لوگ وہاں جمع ہو کر بھاری داموں میں نیلام کی بولی لگا رہے تھے۔ ہم نے ان حضرات سے کہا کہ یہ بولیاں آج ہیں لیکن کل نہ رہیں گی۔ اس لیے جوان لکڑیوں کی قیمت ہے وہ دیجیے اور بس۔ البتہ ہم اتنا تھک گئے ہیں کہ اب آپ کے گھر تک نہیں پہنچا سکتے۔ لکڑی کی فروخت سے ہم سب کو جو کچھ ملا وہ ان دونوں اصحاب کے حوالے کر کے چلے آئے۔ ہمیں یاد ہے کہ اس کے بعد ان میں ایک صاحب نے، اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ اسی

رات کو ریاست کے سول انجینئر کا ایک پیغام آیا کہ وہ کچھ نئی عمارتوں میں مٹی بھروانے کا ٹھیکہ دینا چاہتے ہیں۔ مٹی کے ٹرک وہ قریب ہی میں ڈلوادیں گے۔ اس لیے کام کرنے والوں کو آسانی ہوگی، رقم کی ادائیگی کے بارے میں ان سے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ روزمرہ جتنا کام ہوگا اسی کے لحاظ سے ادائیگی کا انتظام ہوجائے گا۔ اس طرح ان دو افراد کا نہیں بلکہ متعدد لوگوں کی روزی کا انتظام ہوگیا اور عجب نہیں کہ ان میں سے بعض باقاعدہ ٹھیکہ دار ہوگئے ہوں۔ انھی چیف انجینئر صاحب نے پی ڈبلیوڈی کی ایک جگہ سے مٹی کھودنے، سرکاری پمپ سے پانی لانے اور چمنیوں کا انتظام کیا اور اس طرح کچھ بے روزگاروں نے اینٹوں کی ٹھیکہ داری کا کام شروع کردیا۔

ملک کے اکثر علاقوں میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ لوگ محنت مزدوری کے لیے اپنے علاقے میں کام کرتے ہوئے شرماتے ہیں، البتہ وہ باہر آکر یہ کام کرنے لگتے ہیں حالانکہ محنت کے کاموں میں شرمانے کی کوئی وجہ نہیں، صرف سوسائٹی کا حجاب ہے جس کو سماج کے کھاتے پیتے آدمی اگر آگے بڑھ کر اور خود محنت کر کے دور کرسکیں تو یہ مزاج بدل سکتا ہے۔

لوگ محنت کی عظمت ثابت کرنے پر درس دیں اس سے کہیں زیادہ موثر یہ بات ہے کہ ذمہ دار اور نمایاں اصحاب عملی طور پر کام کریں۔

(ہفت روزہ دعوت، دہلی، ۱۰/اگست ۱۹۸۰ء)

□❖□

قومی یک جہتی

جب ضمیر مرجائے تو مظلوم کو بھی ظالم بنایا جاسکتا ہے۔

غالباً ۱۹۵۹ء میں پنڈت نہرو کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ پورے ملک میں قومی یک جہتی کونسل قائم ہو اور اس میں ہر سیاسی پارٹی کے لوگ شریک ہوں۔ برہمانند ریڈی اس زمانے میں وزیر داخلہ تھے اس لیے ان ہی کو اس کا ذمہ دار قرار دیا گیا کہ وہ اس کونسل کو منظم کریں۔ برہمانند ریڈی بے چارے کیا کرتے، ان کا یہ کام ان کے محکمے کے افسروں کے سر پر آ گیا اور انہوں نے ایک عملی تجویز مرتب کی جس کا دفعہ ۱۵۳ میں الف کے نام سے اضافہ کیا گیا۔ اس تجویز کا مقصد تھا کہ ہندستان میں جو اخبارات نفرت انگیز اور اشتعال پرور مضامین لکھتے ہیں ان پر سخت کارروائی کی جائے۔

یہ بات اصولاً صحیح تھی لیکن اس پر جس طرح عمل درآمد ہوا وہ عجیب وغریب تھا۔ نوکر شاہی اس کی ذمہ دار قرار دی گئی اور اس نے پہلا حملہ اقلیت کے اخبارات پر کیا جو بے چارے اس یک جہتی کے سب سے زیادہ حامی تھے۔ دلی میں کسی نیشنل کہلائے جانے والے پریس پر تو کون ہاتھ ڈال سکتا تھا یہی بے چارے دعوت، الجمعیۃ، ریڈیئنس تھے جن پر کئی کئی مقدمات بیک وقت چلا دیے گئے اور ایک مقدمہ شاید پرتاپ پر بھی چلایا گیا۔ نیز مقدمات کا چلنا تو ایک بات تھی لیکن عدالتوں نے ان کے مدیروں کے ساتھ تحقیر و تذلیل کا جو برتاؤ کیا اس کا کوئی شخص تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ رمضان کے دن تھے اسی میں مولانا محمد عثمان فارقلیط مرحوم پر نوٹس جاری کیا گیا اور ایسے بزرگ صحافی کو ہتھکڑیوں کے ساتھ وہاں پیش کیا گیا۔ یوسف صدیقی

صاحب جو کہ بعد میں ریڈیئنس کے ایڈیٹر بنے بزرگ اور بلند شخصیت رکھنے والے ان پر کئی کئی مقدمات چلے۔ خود راقم الحروف کئی کئی مقدمات میں ماخوذ رہا۔ ہر مقدمے میں سزا دینا مجسٹریٹ نے اپنے لیے لازمی سمجھ رکھا تھا۔ اس زمانے کے مجسٹریٹ ڈپٹی کمشنر کے ماتحت ہوا کرتے تھے۔ اسی لیے اگر کوئی مجسٹریٹ شریف اور دین دار بھی ہوتا تو بھی وہ کسی نہ کسی کے حکم کے تحت سزا دینے پر مجبور تھا۔ سزائیں دی ہی کیا جاسکتی تھیں لیکن بار بار گھسیٹنا گویا ضروری تھا۔ راقم الحروف کو یاد ہے کہ جس مجسٹریٹ کی عدالت میں دعوت کا مقدمہ تھا اس کا کہیں تبادلہ ہونے والا تھا اس لیے اس نے اپنی عدالت کے آخری دن میرے ایک مقدمے کا فیصلہ رکھ دیا۔ عدالت کا وقت ختم ہو رہا تھا اور میرا خیال تھا کہ یہ شخص آخری وقت میں کوئی سزا دے گا تاکہ ضمانت بھی نہ ہو سکے لیکن اس بھلے آدمی نے اپنے فیصلے میں تا برخاست عدالت کی سزا اور سو روپے جرمانہ کیا اور نظریں ملائے بغیر اٹھ کر چلا گیا۔ بعد میں کسی معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا کہ ڈپٹی کمشنر نے اسے ہدایت کر رکھی تھی کہ سزا ضرور دی جانی چاہیے اور وہ چونکہ اس سے سرتابی کی مجال نہیں رکھتا تھا، اس لیے اس نے کم سے کم سزا دے کر اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کر لیا بعد میں اس مجسٹریٹ سے ملاقات ہوتی رہی بلکہ اچھے تعلقات بھی ہو گئے اور میں نے ہمیشہ یہی محسوس کیا کہ جب کبھی ضمیر اور انسانیت اور عدل و انصاف کا نام آتا تھا تو اس کی نگاہیں نیچے جھک جاتی تھیں۔

یہ تو ایک پہلو تھا لیکن دوسرا پہلو یہ سامنے آیا کہ ملک بھر میں جن ۱۰۶ اخبارات پر مقدمہ چلایا گیا تھا ان میں سے ۹۶ مسلم اخبارات تھے اور اس طرح یہ تاثر پیش کیا گیا تھا کہ اصل ظالم اور فتنہ پرور یہی لوگ ہیں۔

تقریروں اور تحریروں میں اگر قابل اعتراض باتیں نکالی جائیں تو شاید وزیر اعظم بلکہ صدر جمہوریہ کے خطابات کو بھی قانون کی کسی نہ کسی دفعہ میں لایا جا سکتا ہے اس لیے بے چارے مسلم اخبارات کی تحریروں سے کوئی بات نکال لینا کوئی خاص بات تھی ہی نہیں لیکن اس سے ملک کے عوام میں جو تاثر پیدا کر دیا گیا تھا اس کو دھونا آسان نہیں تھا۔ ایک بار ہندستان بھر کی وزارت داخلہ اور مرکزی وزارت دفاع کو یہ ہدایت دی گئی تھی کہ مسلمانوں کو اس میں بھرتی نہ کیا جائے اور کہا جاتا ہے کہ وزیر اعظم نہرو نے چند ماہ کے بعد ہی اس سرکلر کو واپس لے لیا تھا لیکن پولیس اور

فوج پر یہ تاثر ہمیشہ کے لیے قائم ہوگیا کہ یہ مخصوص طبقہ بھروسے کے لائق نہیں ہے۔اس کے بعد لوگ لاکھ چیختے رہے لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ شاید اس وقت بھی مختلف علاقوں میں گرفتاریوں سے کہیں یہ تاثر نہ دے دیا جائے کہ ظالم اور کوئی نہیں بلکہ یہی طبقہ ہے۔

(ہفت روزہ دعوت، دہلی، ۱۴؍ستمبر ۱۹۸۰ء)

□❖□

وہ قرض پر سود نہیں لیتے

سود کو حرام قرار دے کر اسلام نے انسانوں کو ایک بہترین نظام معیشت عطا کیا ہے۔ یہ بدقسمتی ہے کہ چند مقامات کو چھوڑ کر پوری دنیا اور خود ہمارے ملک کے طول وعرض میں آج سودی نظام رائج ہے۔ اس کے چند ظاہری فائدوں پر گرویدہ ہو کر لوگوں نے اسے اپنا تو لیا ہے لیکن اس کی روح میں جو زبردست ضرر رساں قوت پوشیدہ ہے اس کا اندازہ اسلام سے بے گانہ سماج نے محسوس نہیں کیا۔ چناں چہ سودی نظام کی لعنت آج اپنی تمام تر ہلاکتوں کے ساتھ دنیا پر محیط ہے اور انسان بالخصوص غریب اور پسماندہ لوگ اس کے ظالمانہ اور جابرانہ بندھنوں میں جکڑے ہوئے کراہ رہے ہیں اور کسی نجات دہندہ طاقت کو آواز دے رہے ہیں۔

اسلامی تعلیمات کا پاس ولحاظ، معاشرے میں ان کی اشاعت اور نفاذ کے جذبے نیز ظالمانہ سودی نظام میں جکڑے ہوئے غریب ومفلوک الحال اور فقر وفاقہ زدہ ہندستانی عوام خصوصاً پسماندہ وافلاس زدہ مسلمانوں کو ممکن حد تک اس کے ضرر سے بچانے کی تڑپ لے کر جماعت اسلامی ہند نے اپنی محدود افرادی قوت اور مالی وسائل کے ساتھ چند سال قبل ملک میں بلا سودی سوسائٹیوں کے قیام کی جدوجہد کا آغاز کیا۔

جماعت کی کوشش ہے کہ ایک طرف تو جس حد تک ممکن ہو لوگوں کو سود کی لعنت سے بچایا جائے اور انھیں پاکیزہ ذریعۂ معاش کی اہمیت کا احساس دلایا جائے اور دوسری طرف غیر مستطیع اور ضرورت مند لوگوں کو بلا لحاظ مذہب وملت بلا سودی قرض دے کر اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل بنایا جائے۔ اللہ کا شکر ہے کہ جماعت اور اس کے متوسلین کے زیر اہتمام

اس وقت ملک میں کم وبیش ایک سو بلاسودی سوسائٹیاں کام کر رہی ہیں جن کے ذریعے گاؤں اور دیہات میں چھوٹے پیمانہ پر اور شہروں میں بڑی سطح پر لوگوں کی حتی الامکان خدمت کی جارہی ہے۔ یہ قابل ستائش و تحسین بات ہے کہ بعض مسلم جماعتوں، تنظیموں اور افراد کو بھی اس اہم دینی فریضہ اور وقت کی اہمیت ضرورت کا احساس ہو چلا ہے اور کئی مقامات پر وہ لوگ بھی اسی طرح کی خدمت انجام دے رہے ہیں، جن میں بعض کی خدمات الحمدللہ بہت آگے بڑھی ہوئی اور قابل قدر ہیں۔

جماعت نے پورے ملک میں بکھری ہوئی بلاسودی سوسائٹیوں میں تال میل اور ان کے کاموں میں یکسانیت پیدا کرنے کی غرض سے ۷ تا ۹/ اکتوبر ۱۹۷۸ء کو مرکز جماعت دہلی میں امیر جماعت اسلامی ہند مولانا محمد یوسف صاحب کی صدارت میں وسیع پیمانے پر ایک سمینار منعقد کیا تھا جس میں ملک کی تقریباً ہر بڑی ریاست کے نمائندے، اس کام سے دل چسپی رکھنے والے حضرات اور ماہرین نے شرکت کی۔ بعض اہم غیر مسلم شخصیتیں بھی اس سمینار میں شریک ہوئیں جنھوں نے اسلام کے بلاسودی نظام معیشت کو نظام رحمت ہونے کا اعلان کیا اور قرآن کی بہترین تعلیمات کی بنیاد پر اپنے معاشرے میں بھی بلاسودی سوسائٹیوں کے قیام نیز اس کام میں آنے والی مشکلات کے سلسلے میں حکومت سے ہر ممکن تعاون حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرنے کا عزم کیا۔

اللہ کا شکر ہے کہ جماعت کی بلاسودی سوسائٹیوں کا کام اب وسعت اختیار کر رہا ہے اور اس کی یہ آواز دیگر افراد اور حلقوں تک پہنچ رہی ہے۔

دہلی میں تقریباً سات سال ہوئے ایک دین دار تاجر نے مرکز جماعت اسلامی ہند میں اپنے والد کے ایصال ثواب کے لیے تین ہزار روپے جمع کیے اور یہ اختیار دیا کہ اس رقم کو جس نیک کام میں ضرورت ہو استعمال کرلیا جائے۔ ان کے سامنے جب بلاسودی قرض دینے کا خیال پیش کیا گیا تو انہوں نے اسے پسند کیا۔ چند دن کے بعد انھوں نے اپنی والدہ مرحومہ کے ایصال ثواب کے لیے چار ہزار روپے پیش فرمائے، اس طرح سات ہزار روپے سے زیور کی کفالت پر بلاسودی رقم کا آغاز ہوا۔

پہلے تو اس کارخیر کا اعانت ہی کے ذریعہ آغاز کیا گیا تھا لیکن بعد میں بعض حضرات نے اپنی امانتیں بھی اس شرط پر رکھوادیں کہ ان کو قرض دینے میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ چناں چہ یہ رقم سینکڑوں افراد کو قرض دینے میں استعمال کی گئی اور کم وبیش ۴، ۳ لاکھ روپے اس مد میں گشت کرتے رہے۔

دہلی میں جماعت اسلامی ہند کے مرکز میں قائم شدہ بلاسودی قرض اسکیم سے جو فائدے ہوئے ہیں ان کا صحیح اندازہ یتیموں، بیماروں اور مصیبت زدوں سے مل کر ہوسکتا ہے۔ ان کی دعاؤں کو سن کر خیال ہوتا ہے کہ اس مد میں اعانت کرنے والوں کی کتنی مشکلات ان غریبوں کی دعاؤں سے حل ہورہی ہوں گی۔

تاہم اس اسکیم میں دینے والے کم ہیں اور لینے والے زیادہ۔ حالانکہ مسلمانوں میں خدا کے فضل سے دین دار افراد اور لوگ موجود ہیں اور اگر وہ خود یہ ذمہ داری اٹھائیں یا جو لوگ ان ذمہ داریوں کو اٹھائے ہوئے ہیں ان کے ساتھ تعاون کریں تو یہ کام بہت ہی حسن وخوبی کے ساتھ انجام پاسکتا ہے۔

(ہفت روزہ دعوت، دہلی)

❐❖❐

تقسیم سے پہلے

تقسیم ہند کا پُر آشوب زمانہ تھا۔ بھانت بھانت کی بولیوں اور تجاویز سے فضا مکدر ہو رہی تھی۔ نزاع لفظی اور نزاع عملی دونوں شباب پر تھے۔ مولانا مودودیؒ کی آواز نقار خانہ میں طوطی کی آواز تھی، مگر تھی وہ طوطی ہی کی آواز۔ میٹھی اور رسیلی۔ ہاؤ ہو سے متنفر اور نغمگی کے شیدائی دھیرے دھیرے اس میٹھی اور رس بھری آواز سے اپنے دل ودماغ کو سنوار رہے تھے۔ اجتماع الہ آباد کے بعد جماعت اسلامی کے کسی اور کل ہند اجتماع کا امکان ختم ہو چکا تھا۔ انہیں حالات کے پیش نظر اکابرین جماعت نے علاقائی اجتماعات کا بندوبست کیا۔ مشرقی ہند کا اجتماع پٹنہ میں ہونا طے پایا۔ مولانا مودودیؒ کی شرکت متوقع تھی، مگر وہ جنوبی ہند کے اجتماع میں شرکت کے لیے مدراس چلے گئے اور وہ معرکۃ الآرا خطبہ دیا جس کے متعلق بہت سے لوگوں کا گمان ہے کہ تقسیم کے عرصہ بعد لکھا گیا کیوں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ حالات کی ایسی صریح نشان دہی کوئی پہلے ہی کر سکے۔

بہار فسادات کے بعد گاندھی جی پٹنہ میں مقیم تھے۔ کانگریسی مسلمانوں کے علاوہ دوسرے مسلمان ان سے ملنے نہیں جاتے مگر ہمارے ایک بھائی نے جو خیر سے کبھی سوڈا واٹر مینوفیکچرر رہ چکے تھے، گاندھی کی جائے قیام پر پہنچے اور ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ فوراً اجازت مل گئی۔ اور سوڈا واٹر والے ہی کی حیثیت سے تعارف ہوا اور گفتگو کا آغاز۔ گاندھی جی نے انگلینڈ، افریقہ اور ہندستان کے سوڈا واٹر پر اپنی بیش بہا معلومات سے ان کو مستفید کیا۔ ہمارے سوڈا واٹر والے بھائی نے سوڈا واٹر کی بوتل سے جست لگا کر کوثر و سلسبیل پر بات شروع کر دی۔

جماعت اسلامی کا تعارف کرایا۔ اجتماع کی خبر دی اور شرکت کی دعوت۔ شرکت کے وعدے کے بعد ہمارے تسنیمی بھائی نے آب روانی ململ سے نتھری ہوئی ایک شرط پیش کردی۔ ''ہم ایک اصولی جماعت کے آدمی ہیں، ہمارے یہاں غیر مردوں کے ساتھ عورتوں کا اٹھنا بیٹھنا معیوب وممنوع ہے۔''

گاندھی جی اور منوگاندھی لازم وملزوم تھے۔ عرض کیا گیا کہ منوگاندھی کو عورتوں کی نشست میں بٹھایا جائے گا۔ منوگاندھی نے برا سا منہ بنایا۔ مگر گاندھی جی نے کہا ''کیا حرج ہے، منوایک روز کے لیے پردہ میں بیٹھ جائے گی۔'' اور یہ شرط A PARTY اور THE PARTY جیسی تلخی پیدا کیے بغیر شیرینی کے ساتھ طے پاگئی۔ ہمارے وہ بھائی (شبیر احمد) بفضل خدا باحیات ہیں اور دفتر دعوت ہی میں براجمان۔ بتولوں کی گود میں ایسے ہی شبّیر پیدا ہوا کرتے ہیں۔

بہار کا فساد تمام سابقہ ریکارڈ توڑ چکا تھا۔ لیگی بیان کے مطابق تیس ہزار اور کانگریس کے بیان کے مطابق پانچ ہزار مسلمان شہید ہوئے تھے۔ حقیقت ان دونوں کے درمیان ہی کہیں ہوگی۔ اس سے زیادہ ہولناکی کا کوئی تصور ہی نہیں تھا مگر مرد فرنگ چرچل نے ان اعداد و شمار پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ "Worse may happen" تو ہم جیسے سیاست سے دل چسپی رکھنے والوں کے نزدیک یہ پاگل کا بڑ تھا۔ ہمارے دماغ میں یہ بات سما ہی نہیں سکی کہ اس سے بڑا فساد بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن تقسیم کے وقت اس کی تصدیق ہوگئی۔

دیہاتوں کے پناہ گزین مسلمان پٹنہ شہر میں بھرے پڑے تھے۔ جذبات عروج پر تھے۔ گاندھی جی جماعت اسلامی کے اجتماع میں شرکت کرنے والے تھے، خبر کی تشہیر نہیں ہوئی تھی، پھر بھی پیش بندی کے طور پر جلسہ گاہ میں متوقع ہنگامہ سے نمٹنے کے لیے قرعۂ فال ہمارے نام نکلا۔ اس وقت تک سوشلسٹوں کی ہڑبونگی سیاست سے ٹوٹ کر جماعت میں کوئی نہیں آیا تھا۔ سڑک سے جلسہ گاہ تک گاندھی جی کو بعافیت اپنے چند رفقا کے جلو میں لانے کی ذمہ داری ہماری تھی۔ منوگاندھی بھی آئیں اور کار سے اترتے ہی بچوں کی معیت میں زنانہ حصہ میں چلی گئیں۔ جلسہ گاہ میں نہ ڈائس تھا اور نہ روسٹرم۔ ایک چھوٹی سی چوکی تھی جس پر کھڑے ہوکر مولانا امین احسن اصلاحی تقریر کررہے تھے۔ چوکی کے قریب ہی دری کے فرش پر گاندھی جی رفقا کے

ساتھ بیٹھ گئے اور بڑے غور سے تقریر سننے لگے۔ جلسہ تو بخیر وخوبی ختم ہوگیا، مگر دوسرے روز صبح سویرے ہی سے جماعت اسلامی والوں کو صلواتیں سنائی جانے لگیں۔ وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا کا بہترین مظاہرہ ملیح آباد والے بھائی منشی ہدایت علی مرحوم کے حصہ میں آیا۔ ایک دکان دار نے باصرار بلا قیمت لیے اپنی طرف سے کچھ سامان اجتماع کے لیے دینے کی پیش کش کی تھی۔ انھوں نے معاملہ غازی عبدالجبار صاحب کے سامنے پیش کیا۔ جب ذمہ داروں نے اس دکان دار کے اصرار کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے عطیہ کو قبول کرنے کی منظوری دی تب ہی ہدایت علی مرحوم اس کی دکان سے سامان لائے۔ جلسہ کے دوسرے روز اس دکان دار نے سڑک پر سے گزرتے ہوئے ہدایت علی مرحوم کو دیکھ کر مغلظات گالیاں دے کر بلایا اور دیے سامان کی قیمت فوراً کھڑے کھڑے ادا کردینے کو کہا۔ وہ گالیاں دے رہا تھا اور ہدایت علی مرحوم چپ چاپ سن رہے تھے، جب وہ تھک کر چپ ہوگیا تو بڑی ملائمیت سے ہدایت علی مرحوم نے کہا ''بھائی جان آپ تو بے کار زحمت فرما رہے ہیں، ہم تو پہلے ہی بغیر دام کے مال لے جانے کے خلاف تھے اور آج ابھی اسی وقت ادا کردینے کو تیار ہیں۔'' لا نبے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ہزار بارہ سو کے نوٹ سامنے رکھ دیے کہ جتنی قیمت چاہیں لے لیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا بھلا کرے ہمیں کوئی شکایت نہیں۔ دکان دار ان کا منہ دیکھنے لگا۔ دکان دار کا اندازہ تھا کہ یہ شخص فوراً دام ادا نہ کر پائے گا اور ہم اسے اور ذلیل کریں گے۔ حالانکہ ہدایت علی مرحوم کی مالی حیثیت اس دکان دار سے کہیں زیادہ تھی، وہ ملیح آباد کے آموں کے باغات کے علاوہ بارہ بنکی میں اینٹوں کے بھٹوں کے بھی مالک تھے۔

ہم سے ایک مشہور کانگریسی لیڈر نے جو اب مرحوم ہوچکے ہیں فرمایا: ''تم لوگ زندیق ہو۔'' ہم نے پوچھا کیسے؟ کہنے لگے ''مراتب نہیں کرتے ہو۔ گاندھی جی کو عام لوگوں کی طرح دری پر بٹھا دیا۔'' ہم نے کہا بھئی! ہم سب لوگ دری ہی پر بیٹھے تھے مگر بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔

دوسرے روز گاندھی جی نے پرارتھنا سبھا کے موقع پر حاضرین سے مسلمان فقیروں کے اجتماع میں شرکت کا واقعہ سنایا۔ آئندہ ایسے اجتماع میں پیادہ پا جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔

دوسروں کوشرکت کی تلقین بھی کی۔گاندھی جی کے فقیر اور علامہ اقبال کے فقیر میں بڑا فرق ہے۔ پہلا مرنجا مرنج دعا کرتے چلنے والا۔دوسرا شہنشاہوں کا گریبان پھاڑنے والا۔اگر پٹنہ کے اجتماع میں مولانا مودودیؒ آئے ہوئے ہوتے تو یقیناً گاندھی جی کا تاثر دوسرا ہوتا۔

(ہفت روزہ دعوت، دہلی)

□❖□

درد تو تھا دونوں کو لیکن......

۱۹۴۱ء میں گاندھی جی کے اشارے پر اچاریہ ونوبھاوے نے انفرادی ستیہ گرہ کا پروگرام شروع کیا جو تقریباً ناکام ہوگیا۔ اس کے بعد ۱۹۴۲ء میں کانگریس نے انگریزوں کے خلاف ہندستان چھوڑ دو کی مہم چلائی لیکن انتہائی قربانی دینے کے باوجود یہ تحریک بھی ختم ہوگئی۔ عین اسی وقت بنگال میں قحط کی بلا پھوٹ پڑی اور ہزار دو ہزار نہیں بلکہ لاکھوں قحط زدہ افراد نے کھانا اور روزی کا انتظام نہ دیکھ کلکتہ کی طرف رخ کیا۔ جن لوگوں نے اپنی آنکھوں سے وہ مناظر دیکھے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہزاروں خاندان اپنے بال بچوں کو لے کر کلکتہ کی طرف آرہے تھے لیکن راستے میں چلتے چلتے دم توڑ دیتے تھے۔ پچکے ہوئے پیٹ اور سوکھی ہوئی ہڈیاں کہاں تک پیدل چل سکتی ہیں۔ لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ ماں اور باپ دم توڑ رہے ہیں اور گدھ اور کتے ان کی لاش کو نوچ لیے جارہے ہیں لیکن وہیں ان والدین کے چھوٹے بچے اور بچیاں حیران بیٹھے ہیں کہ آخر وہ کیا کریں۔

سیاسی لوگوں میں کانگریس تقریباً مضمحل ہوچکی تھی اور جو لوگ جیلوں سے باہر موجود تھے وہ چندے کی اپیل کے سوا اور کوئی کام کر ہی نہیں سکتے تھے جس کا مصرف بھی بسا اوقات صحیح نہیں ہوتا تھا۔ قحط زدوں کے لیے کھانے کا انتظام ہونا چاہیے تھا لیکن کھانے کی چیزیں بازاروں میں مفقود تھیں۔ مارواڑی انجمن نے ضرور کچھ لنگر خانے کھول رکھے تھے مگر وہ قطعاً ناکافی تھے۔ ہزاروں بھوکے لوگ خوش پوش مکانوں کے آس پاس منڈلاتے رہتے تھے کہ کہیں سے کچھ بچا کھچا سامان خورد ونوش بھیجا جائے اور وہ اس سے اپنا پیٹ بھریں۔

مسٹر فضل الحق اس وقت مسلم لیگ میں شامل تھے اور وہی بنگال کی وزارت کے وزیر اعلیٰ تھے لیکن مسلم لیگ کے پاس چونکہ کارکن نہیں تھے یا جن کو کارکن سمجھا جاتا تھا وہ سب کے سب لیڈر تھے اس لیے حکومت اپنی جگہ سخت پریشان تھی کہ اس صورت حال سے کس طرح نمٹا جائے۔ اگر کہیں سے غلّہ آ جاتا تھا تو سرکاری ملازم اسے بیچ ہی میں سے اچک لیتے تھے اور عوامی کارکن کی عدم موجودگی سے ان کے مشن کی کامیابی میں کوئی رکاوٹ نہیں حائل ہوسکی تھی۔

عین اسی موقع پر خاک سار تحریک کے بانی علامہ مشرقی نے ایک تجویز پیش کی کہ بنگال کے خستہ حال باشندوں کو وہاں کی سنگ دل نوکر شاہی کے سپرد کرنے کی بجائے ہندستان بھر کے مسلمان اور ہندو آگے بڑھیں اور چار خاندان مل کر ایک فرد کی پرورش اپنے ذمے لیں نیز اس کے لیے خاک سار کارکن برابر توجہ دیتے رہیں کہ یہ آنے والے جس کے گھر میں رہنا چاہیں اسی کے گھر رہیں۔ فضل الحق صاحب نے اس کی تائید کی اور علامہ مشرقی نے کلکتہ پہنچ کر ان سے یہ بات طے کی کہ ہر مصیبت زدہ کے ریل کا کرایہ اور اسے اپنی نئی منزل تک پہنچانے میں پانچ روپے مزید حکومت بنگال ادا کرے گی۔ ادھر انہوں نے اپنے کارکنوں کو ہدایت کی کہ وہ ہر جگہ مسلم اور غیر مسلم اصحاب سے مل کر ان کی فہرستیں تیار کریں تا کہ مسلمان کو مسلمان اور ہندو کو ہندو گھرانے کے سپرد کر دیا جائے۔ انہوں نے بنگال میں بھی اپنے کارکن بھیجے تا کہ وہ آسانی سے سب کو لانے میں مدد دے سکیں۔ چھ لاکھ بنگالیوں کی تعداد مقرر ہوئی تھی اور ہندستان کے مختلف مقامات پر ان کی پرورش کا انتظام بھی ہو گیا تھا۔ لیکن عین اسی وقت قائداعظم مسٹر محمد علی جناح نے فضل الحق صاحب کے اس اقدام کو پسند نہیں کیا۔ اس لیے یہ تعداد ۳۰ یا ۳۲ ہزار تک آ کر رہ گئی۔

بھوپال میں بھی غالباً ۱۳۰ ایسے افراد آئے تھے۔ ان میں کچھ تعلیم یافتہ حضرات تھے تو کچھ ان پڑھ۔ ان میں خواتین بھی تھیں اور ڈھائی سال کے بچے تک۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے کچھ خاندانوں نے ان کی کفالت لے رکھی تھی لیکن ایک ڈھائی سال کے بچے کا کوئی نگراں پیشاب خانے میں لت پت رہتا تھا اور لوگ اس کی طرف دیکھنے کے لیے بھی تیار نہیں، اس کا نام جو فہرست میں آیا تھا وہ بھی ایسا تھا کہ اس سے ہندو ہونے کا بھی شبہ ہوتا تھا اور مسلمان ہونے کا بھی۔ اس کو کلکتہ کے کارکن ایک مرے ہوئے ماں باپ کے پاس سے اٹھا کر لائے تھے اور کسی

پڑوس کے شخص کے کہنے کے مطابق اس کا نام ایکلاس بتایا گیا تھا لیکن بنگال کے لہجے میں چونکہ خ۔ق۔ع وغیرہ کو صحیح طور پر ادا نہیں کیا جاتا۔ اس لیے دوسرے لوگوں نے کہا کہ اس کا اصل نام اخلاص ہے۔

اس لڑکے کو کوئی لینے والا بھی نہیں تھا۔ اس لیے میں ہی اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ ساتھ ساتھ یہ بھی طے کیا کہ بنگال والوں سے پوچھا جائے گا کہ یہ لڑکا مسلمان ہے یا ہندو۔

اس زمانے میں بھوپال میں ہندو مہا سبھا کا زور تھا اور ان کا کام بس یہی تھا کہ وہ پبلک جلسوں میں مسلمانوں کے خلاف شور مچاتے رہیں اس کے صدر ماسٹر نربدا پرشاد صاحب تھے جو بعد میں کانگریس کی طرف سے راجیہ سبھا کے ممبر بھی منتخب ہوئے۔ بے چارے بہت شریف انسان تھے۔ پھر میں نے ان سے پڑھا بھی تھا اس لیے ان کا اور زیادہ احترام میرے دل میں تھا۔

ان کی صدارت میں ہندو بھائیوں کا ایک بڑا جلسہ ہوا جس میں ہم لوگوں پر یہ اعتراض کیا گیا تھا کہ ہم نے ہندو بچوں کو مسلمان بنانا شروع کر دیا ہے اور اس سلسلے میں ایکلاس یا اغلاص کا نام پیش کیا گیا۔ ان حضرات نے کلکتہ کی مہا سبھا والوں سے یہ اصرار کیا کہ وہ ایکلاس کے والد کا نام حاصل کر کے بھیج دیں۔

چناں چہ وہاں سے یہ اطلاع آئی کہ اس کے باپ کا نام مہتو ہے۔ ماسٹر نربدا پرشاد صاحب نے جلسہ میں اعلان کیا کہ وہ اس لڑکے کی پرورش کی ذمہ داری لینے کے لیے تیار ہیں۔ بھوپال کی مقامی حکومت بھی اس بات پر مصر تھی کہ اس لڑکے کو نربدا پرشاد صاحب کے حوالے کر دیا جائے۔ چناں چہ یہ لڑکا ماسٹر پرشاد صاحب کے حوالے کر دیا گیا۔ ادھر اس لڑکے کا حال یہ تھا کہ اس نے ماسٹر صاحب کے یہاں کھانا اور ناشتہ کوئی بھی چیز کھانے سے انکار کر دیا۔ یہ حالت غالباً تین دن باقی رہی ہوگی کہ ایک دن ماسٹر صاحب میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ یہ لڑکا اگر اسی کیفیت میں مبتلا رہا تو مر جائے گا۔ اس لیے اسے آپ اپنے گھر لے جا کر دیکھئے۔ چناں چہ میں اس بچے کو اپنے گھر لے گیا جہاں پہنچتے ہی اس نے خوب کھایا پیا اور یہی معلوم ہوا کہ اسے کوئی کھوئی ہوئی محبت واپس مل گئی ہے۔ اس لڑکے کو ایک رات اپنے گھر رکھ کر دوسرے دن صبح میں نے ماسٹر صاحب کے پاس پہنچا دیا لیکن شام کو انہوں واپس کر دیا اور صاف گوئی سے

کہا کہ ان کے یہاں کی عورتوں میں چھوت چھات اس قدر ہے کہ لڑکا کھانا پینا تو درکنار دن بھر روتا رہتا ہے۔ اس لیے ایسا پروگرام بنالو کہ دن کو یہ ان کے یہاں رہے اور رات کو میرے گھر چلا جائے۔

ماسٹر صاحب اور میرے گھر کے مابین کوئی تین کلومیٹر کا فاصلہ ہوگا۔ تاہم یہ کام بھی میں پابندی سے کرتا رہا۔ اس لڑکے کو جب سائیکل پر بٹھا کر ماسٹر صاحب کے یہاں لے جایا جاتا تھا تو اس کی جان سی نکل جاتی تھی لیکن جب میں شام کو پہنچتا تھا تو وہ خوشی خوشی مجھ سے لپٹ جاتا تھا۔ گھر آ کر بھی وہ کسی نہ کسی خاتون کے بستر پر دراز ہو جاتا یا باورچی خانے جاتا اور خوب دل کھول کر کھاتا پیتا رہتا۔

غالباً اس آمد و رفت میں کوئی ۱۵، ۲۰ دن کا عرصہ گزرا ہوگا کہ ایک دن ماسٹر صاحب نے کہا کہ اسے ان کے یہاں لانے کی ضرورت نہیں کیوں کہ بچے کی پرورش ضروری ہے نہ کہ اسے ادھر سے ادھر ہانکتے پھرنا۔ ان کے گھر میں چھوت چھات ہے جس میں کوئی اور شخص پرورش نہیں پا سکتا۔

اب اس لڑکے کی عمر ۴۰ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ ایک اچھے خاندان میں اس کی شادی بھی ہوگئی ہے وہ ایک اچھا میکانکل ہے اور باعزت زندگی گزار رہا ہے۔

ماسٹر صاحب کا بھی انتقال ہو گیا اور بات بھی پرانی ہو چکی ہے لیکن ان کے یہ الفاظ اب بھی یاد آتے ہیں کہ ان کے گھر کی چھوت چھات میں کوئی اور شخص ان کے یہاں پرورش نہیں پا سکتا۔

(ہفت روزہ دعوت، دہلی، ۱۸ر جنوری ۱۹۸۱ء)

میرا پہلا سفر حج

انسانی تصورات پر بعض اوقات کسی اچھی چیز کا اتنا غلبہ ہوجاتا ہے کہ دن اور رات بس وہی تصور اس کے سر پر غالب رہتا ہے۔ یہی حال ۱۹۶۴ء میں حج بیت اللہ کے شوق کا تھا۔ اس وقت مسلم مجلس مشاورت کا دورہ ہو رہا تھا اور ایک خادم کی حیثیت سے میں بھی شریک تھا۔ مولانا ابواللیث صاحب (امیر جماعت اسلامی ہند) بھی شریک وفد تھے۔ ان سے میں نے گزارش کی کہ اس وقت دل کی حالت بڑی دگرگوں ہے اور جی چاہتا ہے کہ ۱۹۶۵ء کا حج نصیب ہوجائے۔ انہوں نے فرمایا کہ تمہارے ذاتی حالات جتنا کچھ مجھے معلوم ہیں اس میں تم مستطیع تو ہو نہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہی کیفیت مجھ پر بھی طاری ہے لیکن ذاتی لحاظ سے میرا حال بھی اچھا نہیں ہے۔ بس دعا کرو کہ خدا اسباب پیدا کردے اور ہم اور تم ساتھ ہی یہ حج ادا کرسکیں۔

بات آئی گئی ہوگئی۔ میرا اپنا نجی حال یہ رہا ہے کہ جو کچھ معاوضہ مجھے ملتا تھا اس میں مہینہ گزارنا ہی مشکل ہوتا ہے البتہ بھوپال میں ایک آبائی مکان اور کچھ زمین ہے جو میرے استعمال سے باہر ہے اسی لیے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس مکان کی موجودگی میں مستطیع نہ ہونا تو صحیح نہیں۔

مجلس مشاورت کے دورے کا آغاز اتفاق سے بھوپال ہی سے ہونا تھا جس کے بعد اسے مدھیہ پردیش، گجرات اور کرناٹک تک جانا تھا۔ بھوپال پہنچ کر میں نے اپنے بزرگ اور ذی علم چچا سے اس معاملے میں بات کی تو انہوں نے فرمایا کہ اس معاملے کا فیصلہ تم خود اپنے دل سے کرو۔ اس کے بعد ذہن کی گرہیں کھل گئیں اور وہیں میں نے اپنے ایک ساتھی سے ۸ سو روپے

قرض لیے تاکہ جہاز کے کرایہ کی رقم بھیج دی جائے اور قرعے کا انتظار کیا جائے۔

مشاورت کا وفد بھوپال سے آگے چلا گیا اور وفد کے سربراہ ڈاکٹر محمود صاحب سے میں نے دلی آنے کی اجازت لی۔ وہ بے چارے جو اعتماد مجھ پر کرتے تھے اور وفد کے دوسرے حضرات کا بھی جو خلوص تھا اس کے لحاظ سے انہیں کچھ خیال بھی پیدا ہوا لیکن بات آئی گئی ہوگئی۔

اس رقم کو داخل کرنے کے بعد حسن اتفاق سے میرا نام قرعہ میں بھی آ گیا۔ ادھر میں اس کوشش میں رہا کہ کسی طرح بقیہ رقم اور گھر والوں کے کھانے پینے کا انتظام ہوجائے۔ اپنی اہلیہ سے جب اس ارادے کا ذکر کیا تو انہوں نے بھی اس کو نہ صرف سراہا بلکہ وہ بھی کہتی رہیں کہ آپ حج بیت اللہ سے فارغ ہو لیجیے، رہا گھر کا کام تو ہم اپنی محنت مزدوری کرکے اور کچھ معاوضہ دفتر سے لے کر کام چلالیں گے۔

رمضان کے دن آنے والے تھے اور قرعہ چونکہ رمضان سے قبل کے جہاز کے لیے پڑا تھا اس لیے جی بار بار یہ سوچتا تھا کہ اسی جہاز سے سفر کیا جائے تا کہ رمضان میں بیت اللہ میں رہنے کی سعادت بھی نصیب ہوجائے۔

سعودی عرب میں اسی زمانے میں ملک فیصل برسر اقتدار آئے تھے اور ان کے ایک بیان سے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ یہ سعودی فرماں روا شاید اپنی مملکت کو اسلام کا حقیقت پسند خادم بنا سکے تاہم وہاں کے حالات کا زیادہ گہرا اندازہ نہیں تھا کہ وہ معاشرہ کس حالت میں ہے اور ان کے ذہن میں کیا منصوبہ موجود ہے۔ ہمارے پاس سعودی عرب کے اخبارات بھی نہیں آتے تھے بلکہ وہاں کے حالات صرف مصری خبر رساں ایجنسیوں کے ذریعہ معلوم ہوتے تھے جو سراسر سوویت ذرائع ابلاغ کے تحت کام کر رہی تھیں۔ ناصر مرحوم نے عرب برائے عرب قومیت کے قبل اسلام کے لوگوں کو بھی اپنا ہیرو بنا رکھا تھا اور حالات کا رخ دکھائی دے رہا تھا کہ اپنے ڈھانچے میں لانے کے لیے اس عظیم تحریک کی بربادی پر خوش ہوتا تھا۔ (یہ ایسی ہی بات ہے جیسے جماعت اسلامی ہند کی تحریک کو ختم کرنے کی کوشش میں ہندستان کے خاصے طبقات کے ذہن کو توڑا مروڑا گیا ہے اور اس میں نادانستہ طور پر بعض اچھے مسلمان افراد کو بھی استعمال کرلیا گیا ہے)

خیر یہ تو ایک الگ موضوع ہے، میں جب دلی آیا اور اپنے جانے کی تیاریاں کر رہا تھا

کہ اچانک ایک دن سعودی عرب کے سفارت خانے سے ایک سکریٹری صاحب کا فون آیا اور انہوں نے کہا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ مجھے کبھی کسی سفارت خانے جانے کا کوئی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ خود سعودی یا پاکستانی یا دوسرے مسلم وغیر مسلم سفارت کاروں سے ملنے کے بارے میں بھی یہ سوچا کرتا تھا اور اب یہی سوچتا ہوں کہ ان سے اگر کہیں اتفاقاً ملاقات ہو جائے تو اچھا ہے ورنہ ہم کو اپنے کاموں ہی سے تعلق رکھنا چاہیے۔ سعودی عرب کے کسی سفارت کار سے بھی کبھی کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے میں نے فون ہی پر دریافت کیا کہ کوئی بات فون پر کہنے کی ہو تو برائے مہربانی بتادیں ورنہ میں ان کے پاس دو تین دن میں پہنچ جاؤں گا۔ وہ کہنے لگے کہ نہیں تم سے آج ہی ملنا ہے۔ اس لیے وہ خود ہی ملنے آنا چاہتا ہے۔ اور وہ تشریف لے آئے اور فرمایا کہ سعودی حکومت چھ صحافیوں کی ایک ٹیم کو دس دن کے دورے پر اپنے یہاں بلانا چاہتی ہے۔ اس لیے تم بھی چلے جاؤ۔ انہوں نے کہا کہ اسٹیٹس مین، ٹائمز آف انڈیا، پریس ٹرسٹ اور ہندستان ٹائمز کے چار اصحاب جا رہے ہیں۔ یہ پروگرام فوراً ہی طے کرنا ہے۔ اس لیے دہلی کے دو اور اصحاب میں ایک تمہارا نام بھی ہے اور دوسرا نام تم تجویز کرو۔ میں نے اپنے سلسلے میں ان سے عرض کیا کہ میرے نام کا قرعہ پڑ چکا ہے۔ اس لیے میں جانے سے معذور ہوں۔ البتہ میرے ایک ساتھی کو آپ دعوت کی طرف سے لے جائیے اور دوسرا نام مولانا عثمان فارقلیط صاحب مرحوم کا تجویز کیا۔ مولانا مرحوم شاید مجھ سے بھی زیادہ کم مستحق اور گوشہ نشین تھے، پھر انہیں بار بار پیشاب آنے کی تکلیف تھی اس لیے انہوں نے یہ عذر پیش کیا۔ میرے سلسلے میں سکریٹری صاحب نے کہا کہ میں ضرور جاؤں اس سے سعودی عرب کے حالات کو دیکھنے کے علاوہ عمرے کا بھی موقع مل جائے گا اور اس سے حج پر جانے میں کچھ سہولت ہوگی۔ دفتر دعوت جس جگہ ہے وہیں اس زمانے میں مرکز جماعت اسلامی بھی تھا اور مولانا ابواللیث صاحب وہیں موجود تھے انہوں نے بھی فرمایا کہ تم چلے جاؤ۔ تاہم طبیعت اس وقت تک اس بات پر آمادہ نہیں تھی کہ بحری جہاز کا سفر چھوڑ کر یہ سفر طے کیا جائے اور پھر دوبارہ حج کے اسباب فراہم کیے جائیں۔ میں نے مولانا اور سکریٹری صاحب سے دوسرے دن کے لیے مہلت مانگی تاکہ فیصلہ کرنے میں ساری صورت حال کو سمجھ سکوں اور گھر کے لوگوں سے بھی مشورہ کرسکوں۔ جب میں گھر آیا اور اپنی اہلیہ

سے تذکرہ کیا تو انہوں نے کہا کہ خدا کے گھر کا یہ بلاوا ہے۔ اس لیے مجھے ضرور جانا چاہیے رہا گھر کے لوگوں کا معاملہ تو اسے ہم پر چھوڑیے اور توکل کے ساتھ جائیے۔

دوسرے دن سعودی سکریٹری صاحب پھر ایک دعوت نامہ لے کر تشریف لے آئے اور میں نے بھی اس شرط کے ساتھ منظوری دے دی کہ دس دن آپ کا مہمان رہ کر مجھے حج تک وہاں میرے اپنے خرچ پر ٹھہرنے کی اجازت دے دی جائے گی جس کے بارے میں انہوں نے یہی فرمایا کہ آپ سعودی حکومت کے مہمان رہ سکتے ہیں لیکن اگر یہ بات ناپسند ہو تو آپ کو وہاں ٹھہرنے کی اجازت ہے۔

ادھر گھر کی حالت تو جیسی کچھ تھی وہ تو تھی ہی میرے پاس پاسپورٹ بھی نہیں تھا بلکہ ایک بار پاکستان جانے اور عزیزوں سے ملنے کے لیے پاسپورٹ کی درخواست دی تھی لیکن اس سے انکار بھی ہو چکا تھا۔ تاہم سعودی دعوت نامے کے ساتھ پاسپورٹ کی درخواست دی۔ غالباً جانے میں صرف ۵، ۶ دن رہ گئے تھے۔ تاہم ایک حکومت کے دعوت نامے کے بعد اس کو رد کرنا آسان نہیں تھا۔ اس کے دوسرے دن ہی وزارت خارجہ کے ایک انڈر سکریٹری کا فون آیا کہ تم مجھ سے آکر مل لو۔ ان صاحب کی عربی دانی اور اردو مضمون نگاری سے میں عرصے سے واقف تھا لیکن یہ اسی وقت معلوم ہوا کہ یہ وزارت خارجہ میں اتنے اہم عہدے پر مامور ہیں۔ بہر حال ان کے دفتر گیا تو انہوں نے پہلا سوال یہ کیا کہ یہ دعوت نامہ آپ کو کیوں ملا جس پر میں نے کہا کہ یہ بات آپ سفارت خانے سے دریافت کیجیے اور دوسرے مدعو اخبار نویسوں سے بھی پوچھ لیجیے۔ کہنے لگے آپ کو پاسپورٹ نہیں دیا جا سکتا۔ میں نے کہا کہ آپ نے یہ جواب دے دیا ہے۔ میں دعوت نامے کے جواب میں یہی معذرت کر دوں گا۔ کہنے لگے کہ نہیں بھائی یہ حکومتوں کا معاملہ ہے اس لیے پاسپورٹ تو دینا ہی ہوگا لیکن کوئی دو ڈھائی فٹ فائلوں کی طرف اشارہ کر کے ہنستے ہوئے بتایا کہ ان کی رو سے تم کو پھانسی بھی دی جا سکتی ہے اس لیے اب اس کا ایک ہی علاج ہے کہ تم جا رہے ہو تو کچھ ایسا سرکاری لٹریچر بھی لیتے جاؤ جس سے تم بتا سکو کہ ہندستان کے مسلمان بہت آرام سے ہیں۔ میں نے ان صاحب سے کہا کہ میں اگرچہ اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے نہیں جا رہا ہوں لیکن اگر کسی نے کوئی سوال کیا تو میں وہی کہوں گا جو اپنے ملک میں کہتا ہوں۔ رہا

پاسپورٹ دینے کا سوال تو آپ دیں یا نہ دیں یہ آپ جانیں اور سعودی حکومت جانے۔ آخر میں ان انڈر سکریٹری صاحب نے کہا کہ ایک بات یاد رکھنا کہ وہاں بھی قدم قدم پر تمہارے پیچھے ہماری سی آئی ڈی کے لوگ لگے رہیں گے اور شاید ایسا ہوا بھی لیکن مجھے برابر یہ احساس ہوتا رہا کہ جس ملک کی نوکر شاہی اپنے شہری کارکنوں پر بدگمانی کرتی رہنے کی عادی ہو آخر اس نوکر شاہی کے پنجے میں پھنسنے والے لیڈر واقعی رہنمائی کے لائق ہیں یا خود وہ نوکر شاہی کے ہاتھوں میں گرفتار ہیں۔

دس بارہ دن سعودی عرب کے مختلف مقامات کا دورہ کرنے اور ملک فیصل سے لے کر ہر جگہ کے ذمہ داروں سے ملاقات کرنے کے بعد باقی سب لوگ ہندستان واپس آ گئے اور میں نے سب سے اجازت لے کر ٹونک کے مسافر خانے میں اپنا بستر جمایا اور جس طرح بھی ہوا وہ دن عافیت سے گزار کر اپنے پہلے حج کا فریضہ ادا کیا۔ بعض حاجیوں کی معرفت گھر سے کچھ رقم بھی آ گئی اور اس طرح یہ ایام گزر گئے۔ کبھی کبھی چند کھجوریں کھا کر آب زمزم پر بھی گزارا ہوا لیکن یہ محسوس بھی نہیں ہوا کہ کبھی کوئی تکلیف ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اس فریضے کو قبول کرے۔

(ہفت روزہ دعوت، دہلی، ۲۲ر مارچ ۱۹۸۱ء)

□❖□

تین کردار

اب ۱۹۸۱ء میں ہولی جیسے تہوار قومی نہیں رہے بلکہ ایک فرقے کے تیوہار بن گئے ہیں لیکن ۱۹۴۷ء سے بعد کے ۷، ۸ سال تک یہی چرچا عام تھا کہ ان تقریبات میں ملکی حیثیت یا کم ازکم سماجی حیثیت سے پورے اہل ملک کو سماج میں شامل کردیا جائے۔ آج تو لوگوں نے یہ دیکھا ہے کہ پولیس اور مجسٹریٹ انتظام سنبھالنے میں شریک رہتے ہیں اور ان پر کوئی رنگ پھینکنے والا رنگ نہیں پھینک سکتا لیکن آزادی کے ابتدائی دور میں یہ باتیں کہاں تھیں۔ کمیونسٹ پارٹی کے مسلمان کارکن انتہائی سرگرمی سے ان جلوسوں میں حصہ لینے لگے تھے۔ وہی رنگ اور تلک لگائے ہوئے اور سر سے پاؤں تک ہولی کے رنگ میں رنگے ہوئے ان بے چاروں میں ملی حمیت یقیناً تھی لیکن مرعوبیت کی وجہ سے انہوں نے اسی میں عافیت سمجھی تھی کہ شاید اس طرح دوسری قوموں کا تشابہ اختیار کرنے سے اگر حالات درست ہوسکیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

غالباً ۱۹۵۲ء کا ذکر ہوگا۔ اسی کے آس پاس ایک ہی مقام کے تین اصحاب کا کردار سامنے آیا۔ ایک تو مسلمان کمیونسٹ حضرات تھے جنہوں نے ہولی کو قومی تیوہار بنا کر اس کے جلوسوں میں شرکت کی۔ یہ لوگ ۳، ۴ سے زیادہ نہیں تھے اور وہ بھی جلوس میں کہیں سے گڑبڑ ہونے کی وجہ سے کسی گھر ہی میں پناہ پانے کے لیے مجبور ہوگئے تھے۔ دوسرا کردار کانگریس کے ایک مسلمان ممبر پارلیمنٹ کا تھا جن کو جب ان کے غیر ساتھیوں نے رنگنا چاہا تو انہوں نے کہا کہ اگر تم لوگ بقرعید پر ہماری ہی طرح قربانی کرو تو یہ بات سوچی جاسکتی ہے کہ یہاں کے سب تیوہاروں کو قومی تقریب تسلیم کیا جائے لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو ہم کسی مرعوبیت کے آگے جھکنے کے

لیے تیار نہیں۔ تیسرا کردار ایک مسلمان عالم کا تھا جو اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے کچھ کام کر رہے تھے کہ کچھ لوگوں نے باہر سے آکر ان پر رنگ کی بارش کر دی۔ مولانا نے باہر نکل کر دیکھا تو ایک پولیس انسپکٹر بھی قریب ہی میں کھڑا تھا۔ مولانا اپنا ڈنڈا اٹھا کر رنگ پھینکنے والوں کی طرف لپکے تو انسپکٹر نے ان سے سوال کیا کہ آپ ہمیں بتائیں کہ کس نے آپ کو ستایا ہے تو انہوں نے فرمایا کہ ستانے والے یہ لڑکے نہیں بلکہ انسپکٹر صاحب آپ ہی نے مجھے یہ تکلیف دی ہے۔ یہ تین اصحاب تین مختلف کرداروں کی علامت تھے لیکن آخر کار اس میں جیت اسی کردار کی ہوئی جو نہ دوسروں کی تقریبات میں کوئی گڑبڑ کرنا چاہتا ہے اور نہ اپنے آپ کو اس میں ملوث کرنے کے لیے تیار ہے۔

ہمیں کسی فرقے کے کسی تیوہار سے کوئی بغض نہیں جس کے ذہن اور روایات میں اپنے لیے کوئی خاص انداز تقریب پایا جاتا ہے وہ اسے انجام دے لیکن اپنی تقریبوں کو ملکی یا سماجی قرار دے کر دوسرے فرقوں کو بھی اس میں شامل کرنے کی کوشش کرنا ایک لاحاصل سی چیز ہے جو اچھا ہوا کہ ۲۰، ۲۵ سال بعد ختم ہوگیا۔ ان تقریبات کی سنجیدہ محفلوں میں غیر مسلموں کے ساتھ شریک ہونا ایک الگ بات ہے لیکن جب لوگ دوسروں کو اپنے رنگ میں رنگ لینا چاہیں تو اس کی نوعیت دوسری ہی ہو جاتی ہے۔

اس بار اس سے پہلے بھی دس بارہ سال سے یہ تقریبات ایک فرقے کے لیے مخصوص ہوگئی ہیں لیکن اگر مرعوبیت اور خوف زدگی یا سطحی ذہنیت سے ان کو اختیار کیا جاتا تو ہوسکتا تھا کہ ان کی نوعیت کچھ اور ہو جاتی۔

(ہفت روزہ دعوت، دہلی، ۵/ اپریل ۱۹۸۱ء)

□❖□

مرحوم مصطفیٰ رشید شیروانی

مصطفیٰ رشید شیروانی مرحوم جیپ فلیش لائٹ کی صنعت کو فروغ دینے میں ایک ماہر صنعت کار تھے۔ ایسے صنعت کار جس نے اپنی محنت سے ایک صنعت کا آغاز کیا اور پھر اسے کامیابی کی منزل تک لے گئے۔ اس بڑے کارخانے میں کم از کم چار ہزار افراد کام کر رہے ہیں۔ پھر اس کے ذیلی مراکز ہندستان بھر میں بہت کافی ہیں۔ یہ ساری صنعت ۱۹۴۷ء کے بعد شروع ہوئی۔ حالانکہ یہی وہ دور تھا جب شمالی ہند کے مسلمان صنعت کار اپنی صنعتوں کو چھوڑ چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ تاہم یہ صنعت چنداں اہمیت نہیں رکھتی۔ جس ملک میں ٹاٹا اور برلا موجود ہوں وہاں اس چھوٹی سی صنعت کی اہمیت ہی کیا ہے۔ البتہ ان کارخانوں کے مقابلے میں جیپ لائٹ کے اندر ایک خصوصیت تھی کہ اس میں لوگوں کو پراویڈنٹ فنڈ ملتا تھا اور جس کے سرکار میں جمع ہو جانے کی رسم ہے۔ یہاں اس فنڈ کو صنعت کے حصص کے طور پر شامل کر لیا گیا۔ اس طرح یہاں کے سب کارکن باقاعدہ حصہ دار بن گئے۔ یہ ایک نیا رخ تھا جو اہل صنعت کے لیے ایک نیا پہلو کھولنے کا سبب تھا تاہم اس بات کو بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ مساویانہ طرز پر کام کرنے والا ایک فرد مسلمانوں میں پیدا ہو گیا اور اس نے ایک اعلیٰ نگاہ سے حالات کو دیکھا۔

شیروانی مرحوم نے سیاست میں بھی حصہ لیا اور شاید یہ تنہا آدمی تھے جن کو راجیہ سبھا میں تین بار ممبر چنا گیا اور اتفاق ہے کہ دو بار وہ اندرا کانگریس کی طرف سے یہ نشست حاصل کر سکے اور اس بار دیوراج کانگریس کی جانب سے تاہم ان کے سلسلہ میں یہ بات ہر حلقے میں عام تھی کہ وہ کہیں بھی رہیں ان کا نقطۂ نظر تعمیری ہے اور اسی لحاظ سے ہر پارٹی اُن کی قدر کرتی تھی۔ تاہم

ایسے سیاست داں خال خال ہی سہی لیکن ملک میں موجود ہیں۔

شیروانی صاحب مرحوم سے میری ملاقات چین کی جنگ کے دوران پہلی مرتبہ ہوئی۔ ڈاکٹر سید محمود صاحب نے شہر کے ۱۰، ۱۵ حضرات کی ایک میٹنگ بلائی تھی جس میں مسٹر اور مولانا سب ہی شریک تھے۔ مجھے بھی ڈاکٹر صاحب نے یاد فرمالیا تھا۔ وہاں یہ بات سامنے آئی کہ چین کے حملے کے خلاف مسلمانوں کو بھی آگے بڑھ کر وزیر اعظم کو اپنی ہمدردی کا اظہار کرنا چاہیے۔ یہ بات اپنی جگہ ٹھیک بھی تھی۔ البتہ اظہار خیال میں میں نے اس بات پر زور دیا کہ جنگ اور صلح دونوں حالات میں اسلام نے کچھ ضابطے مقرر کیے ہیں۔ اس لیے ایسی پیش کش کے ساتھ یہ بات بھی سامنے لانے کی ضرورت ہے کہ ایک جنگی کونسل بنالی جائے جس میں مسلمان بھی شریک ہوں تاکہ وہ آگے کے فیصلے میں بھی اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کرسکیں اور صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط بتاسکیں۔ ایک ہنگامی جلسے کے لیے اس طرح کی بحثیں سمجھنا ذرا مشکل ہی ہوتا ہے۔ تاہم خیال تھا کہ کچھ حضرات علماء اس کو اپنا موضوع بناسکیں لیکن عجیب بات تھی کہ صرف ایک نوجوان ممبر راجیہ سبھا نے اس کی بھرپور تائید کی اور وہ یہی مصطفیٰ رشید شیروانی تھے:

سرِ خدا کہ عارف صادق بہ کس نہ گفت
درحیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

شیروانی صاحب سے اس کے بعد کسی دن کسی استقبالیہ میں کوئی ملاقات ہوگئی تو ہوگئی لیکن میرے ذہن میں یہ سوال برابر باقی رہا کہ اس حوصلہ مند انسان سے خدا کو کچھ نہ کچھ کام ضرور لینا ہے۔

اس سے کچھ پہلے یوپی میں دینی تعلیمی کونسل قائم ہوچکی تھی۔ اور شیروانی صاحب سے جب گفتگو ہوئی تو اندازہ ہوا کہ وہ اگرچہ اس سے بڑی کوشش کے خواہش مند ہیں لیکن اس ابتدائی کوشش کی وہ پوری طرح حمایت کرتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ انھی دنوں ڈاکٹر سید محمود صاحب سے میں نے ایک بار پوچھا تھا کہ ہندستانی مسلمانوں کی نوجوان نسل میں سے آپ کن افراد پر زیادہ اعتماد کرتے ہیں۔ فرمانے لگے کہ میں خود ہر وقت اسی تلاش میں رہتا ہوں اور بڑی مشکل سے میرے ذہن میں تین نام آئے

ہیں اور اس میں شیروانی صاحب کو انھوں نے صف اول میں شامل کیا تھا۔

میری صحافتی ذمہ داریاں زیادہ سے زیادہ بڑھ رہی تھیں اس لیے بیش تر وقت اپنے ہی کاموں میں مصروف رہتا تھا۔ البتہ جب مسلم مجلس مشاورت کی تشکیل عمل میں آئی تو اس وقت پھر شیروانی صاحب سے ذرا تفصیل سے بات ہوتی رہی۔ مشاورت کسی سے چندے بھی نہیں لیتی تھی لیکن مجھے یاد ہے کہ انھوں نے بڑے اصرار سے بارہ ہزار روپے کی رقم لا کر دی جسے باقاعدہ حساب کھول کر بینک میں داخل کر دیا گیا لیکن ہمارا کہنا............ تو یہی تھا کہ دولت تو آنی جانی چیز ہے۔ اصل کام تو یہ ہے کہ مسلمان اکابر عوام سے ملیں اور پھر یہ اکابر اور اصاغر تمام ملک میں رحمت ورافت کی ایک فضا قائم کریں۔ انھیں اس سے اتفاق تھا لیکن کسی نہ کسی وجہ سے وہ آگے نہ بڑھ سکے۔ ورنہ ہوسکتا تھا کہ یہ شخصیت مسلم زندگی میں زیادہ بڑا رول ادا کرسکتی۔

شیروانی صاحب مرحوم کی آخری کوششوں میں ان کی تعلیمی مساعی ہیں اور اندازہ ہے کہ وہ بیس کالجوں اور ہائی اسکولوں کو اپنی گرہ سے چلا رہے تھے۔ اس کے علاوہ صاحب استعداد طلبا کے لیے بھی ان کی خواہش تھی کہ اس کا تجزیہ کر کے مسلمان اپنی نئی نسل کو آگے بڑھائیں۔ انھوں نے خود بھی اس سلسلہ میں بہت کچھ کیا۔

شیروانی صاحب نے دو یا تین بار حج بھی کیا تھا جو اُن کی دینی حس کا نمونہ تھا۔ انفرادی طور پر ان کی شائستگی اور خیر خواہی ہندستان کے اسلامی کلچر کی ایک علامت تھی۔ بہرحال ایک باعمل حساس اور دینی مزاج رکھنے والا فرد ہماری ملت سے جاتا رہا اور اگرچہ موت کا وقت تو مقرر ہے مگر یہی خیال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی موت قبل از وقت تھی۔

خدا ان کی بال بال مغفرت کرے۔ یہی ایک مومن کی دوسرے کے لیے بہتر دعا ہوسکتی ہے۔

(ہفت روزہ دعوت، دہلی، ۱۰رمئی ۱۹۸۱ء)

□❖□

مرحوم نواب محمد صابر قلی خاں آف محمد گڑھ

ایک اہم شخصیت اٹھ گئی

نوابوں اور مہاراجوں کا دور اب تو جا چکا لیکن جب یہ لوگ موجود تھے اور ان کی ریاستیں قائم تھیں اس وقت بھی خود ان ریاستوں کے باشندے بہت کم ان کے گرد جمع ہوتے تھے۔ چند استثنا ضرور تھے مگر عیش و آرام میں ڈوبے ہوئے اس جم غفیر میں ان کی آواز برائے نام تھی۔ جن لوگوں کو ان ریاستوں میں زندگی گزارنے کا موقع ملا ہے، انھیں معلوم ہے کہ ان والیانِ ریاست کی تفتیش کی زندگی اور عوام پر ان کا رعب ودبدبہ کتنا تھا۔ ایک مشہور مسلمان ریاست کے ایک ولی عہد صاحب تھے۔ وہ جب کسی جگہ شکار کو جاتے تو بیسیوں دیہات کے لوگ اپنے کنبوں کو لے کر پہاڑوں پر چلے جاتے تھے۔ پھر بھی جو فرد ان کے عملے کو ملتا اسے وہ ایک فصیل میں لاکر گھیرے رکھتے تاکہ جب شہزادہ صاحب آئیں تو ان کے شیر کا شکار کا گھیرا کرنے کے لیے یہ لوگ موجود رہیں۔ کوئی شیر اگر کسی آدمی کو مار لیتا تو اس کی لاش کہیں گڑھے میں پھینک دی جاتی تھی۔

ان ہی صاحب کو کہیں جانے کا اتفاق ہوا جہاں کے تھانے دار مشہور محدث علاّمہ عبدالحق دہلوی کی اولاد میں سے تھے۔ نیک شریف النفس اور صاحب مطالعہ انسان۔ ان سے کسی بات پر شہزادہ صاحب خفا ہو گئے تو انہیں اپنے ایک شریر گھوڑے پر بٹھا کر اس کے چابک رسید کی اور جب گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد وہ گھوڑا واپس آیا تو لوگوں نے دیکھا کہ تھانے دار کا پاؤں رکاب میں الجھا ہوا ہے لیکن ان کا سر پاش پاش ہے۔ شہزادہ کی والدہ محترمہ کو جب یہ خبر ملی تو وہ

بیٹے پر ناراض بھی ہوئیں اور تھانے دار کے جانشینوں کو معقول معاوضہ بھی دیا بلکہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ واقعہ شہزادے کی موت کا بھی سبب بنا۔ تاہم یہ خیالات اکثر ریاستوں میں موجود تھے۔ ان شہزادے صاحب کی موت کے بعد ان کے بڑے لڑکے نے خودکشی کرلی اور چھوٹا دیوانہ ہوکر مرالیکن یہ قدرت کے اسباب ہیں۔

ریاستیں ختم ہوگئیں اور ان کے والیوں اور رشتہ داروں کو وظائف ملنے لگے تاہم یہ تصور ہر جگہ موجود تھا کہ یہ طبقہ کسی کام کا نہیں۔

۱۹۶۴ء جب مسلم مجلس مشاورت کی تشکیل عمل میں آئی اور اس موقع پر ہر جگہ سے یہ احساس پیدا ہوا کہ مسلمانوں کی یہ مشترکہ کوشش کامیاب ہونی چاہیے۔ اس وقت ملک کے ہزاروں ذی شعور مسلمانوں نے اس کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ غالباً اسی وقت محمد گڑھ کے نواب محمد صابر علی خاں صاحب کا نام بھی سامنے آیا۔ وہ اس وقت تک سرکار کا وہ عطیہ پاتے تھے جسے دستور نے والیان ریاست کے لیے منظور کیا تھا۔ ان کی اپنی زمینیں بھی تھیں، ایک قلعہ بھی ان کی تحویل میں تھا۔ محمد گڑھ مدھیہ پردیش کی ایک ریاست تھی جہاں کا سرکاری نظم ونسق ان پچھلے والیان ریاست کے سلسلے میں نسبتاً زیادہ سخت تھا اور وہاں مہارانی سندھیا اور مہاراجہ دیورس کے علاوہ کوئی ایسے والی موجود بھی نہیں تھے جو جرأت سے کوئی بات کہہ سکے۔ ہر جگہ کلکٹروں بلکہ تحصیلداروں کا راج تھا اور اکثر والی ریاست ان ہی کی خوشامد میں لگے رہتے تھے۔ مسلم مجلس مشاورت کے قیام کے وقت اسی ریاست کی ایک اور شخصیت سامنے آئی جو یہی نواب محمد گڑھ کی تھی ان کی ولولہ خیزی اور سوجھ بوجھ کا اندازہ ان کے خطوط سے ہوا کرتا تھا لیکن ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوسکی تھی۔ میرے اپنے ذہن میں بار بار والیان ریاست کے قدیم تصور کی وجہ سے ان کے بارے میں بھی کوئی خاص دل چسپی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ مجلس مشاورت کا مدھیہ پردیش میں بھی دورہ ہوتا تھا اور چونکہ میرا تعلق اسی علاقے سے رہا ہے، اس لیے میں نے ڈاکٹر محمود صاحب مرحوم سے عرض کیا کہ وہاں اس مجلس کا صدر کسی جری لیکن قابل شخصیت کو ہونا چاہیے۔ چناں چہ بھوپال ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس سلام الدین خاں صاحب سے عرض کیا گیا اور انھوں نے اس منصب کو قبول کرلیا۔

مشاورت کا وفد مدھیہ پردیش کے دورے پر جب بھوپال پہنچا تو میں دو دن پہلے وہاں پہنچ گیا تھا۔ اسی وقت مشاورت کے ہم خیالوں کی ایک نشست ایک جگہ منعقد ہوئی اور وہیں نواب صاحب محمد گڑھ سے ملاقات ہوئی۔ میرے ذہن میں نوابوں کی جو تصویر تھی وہی ان کے بارے میں بھی ابھری ہوئی تھی۔ اس نشست میں بیش تر لوگ میرے جانے بوجھے تھے لیکن ایک صحت مند، مشرع صورت صاحب میرے لیے نئے تھے۔ بعد میں جب انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو معلوم ہوا کہ یہی محمد گڑھ کے نواب محمد صابر قلی خاں صاحب تھے۔ بھوپال اور پھر مدھیہ پردیش کے پروگرام کو آخری شکل دینا تھی۔ بھوپال کی سابق بیگم صاحبہ نے اپنے محلات کو وفد کی قیام گاہ کے لیے پیش کیا تھا لیکن نواب صاحب کی رائے تھی کہ یہ وفد شہر میں عام لوگوں کے ساتھ رہے۔ البتہ بیگم صاحبہ صدر مجلس کے عصرانے میں موجود رہیں۔ شہر میں جلوس جلسہ عام، مسلم اور غیر مسلم اکابر سے ملاقاتیں، نوجوانوں سے تخاطب اور مسلم اداروں کو دیکھنا غالباً وہاں کے پروگرام میں شامل تھا جو اپنی اپنی جگہ حسن خوبی سے انجام پائے۔ نواب محمد گڑھ ان سب سرگرمیوں میں پیش پیش تھے۔

دینی اور ملی درد میں ڈوبا ہوا یہ انسان مئی کے آخری ہفتے میں اپنے خدا کو پیارا ہوا اور خدا سے امید ہے کہ وہ اپنے اس پیارے بندے کو اپنی آغوش میں لے لے گا۔ تاہم ان کی باتیں یاد آتی ہیں۔

وہ نواب ہونے کے باوجود انتہائی منکسر المزاج انسان تھے۔ ان کو مطالعہ کا بھی بڑا شوق تھا اور دینی لٹریچر نیز انگریزی ادب پر ان کی معلومات خاصی تھیں لیکن اس سب سے بڑھ کر ان کا دینی اور ملی ولولہ انہیں ہر وقت بے چین کیے رکھتا تھا۔

(ہفت روزہ دعوت، دہلی، ۱۴ر مئی ۱۹۸۱ء)

□❖□

ہمارے اسلاف کا نقطۂ نظر

حضرت مولانا شیخ محمد یعقوب صاحب مجددی کا ابھی چند سال ہوئے انتقال ہوا ہے۔ ایک دفعہ ۱۹۴۷ء کے بعد ان کے کسی معتقد نے ان کی کسی مجلس میں کہا کہ یہ ہندستان ان کے رہنے کے لائق نہیں رہا ہے۔ حضرت شیخ نے پوچھا کیوں؟ فرمانے لگے کہ اب جو مہتر ان کے یہاں آتے ہیں ان کا مزاج پہلے سے بہت بدل گیا ہے۔ پہلے وہ ہم سے حضور کہہ کر بات کرتے تھے لیکن اب یہ رخ بدلتا جا رہا ہے۔ بات آئی گئی ہوئی لیکن دوسرے دن مولانا یعقوب صاحب نے اپنی مجلس میں فرمایا کہ لوگ اپنے پرانے روایتی مزاج کو نہ جانے کیوں دینی وقار کا مسئلہ بنا لیتے ہیں، اس کے بعد انھوں نے سائل کا نام لیے بغیر واقعہ دہرایا اور کہا کہ خود ان کی خانقاہ میں باہر اور اندر جو مہتر اور مہترانیاں آتی ہیں ان سے ہمیں کوئی شکایت نہیں۔ ہمارے بچے بوڑھی مہترانیوں کو خالہ کہتے رہے ہیں وہ ہمارے بچوں کے پاس آتی ہیں تو ان کی پان وغیرہ سے بھی تواضع کی جاتی ہے۔ اور یہ معاملہ آج کا نہیں ۴۰، ۵۰ سال سے برابر چل رہا ہے۔ یہ لوگ بھی ہمارے گھر کے بزرگوں کو بڑا اور چھوٹوں کو اپنا عزیز سمجھتے ہیں اور یہ انسانی مساوات کی علامت بھی ہے۔ اگر لوگوں نے کسی انسان کو اپنے سے چھوٹا سمجھا تو یہ اس کا اپنا قصور ہے نہ کہ کسی اور کا۔

ہندستان میں جو مسلمان آئے انھوں نے شاید اپنی حکومت کی حکمت عملی کو اسی بات پر مرکوز رکھا کہ وہ راجپوتوں، برہمنوں اور کاروباری طبقہ میں اپنا اثر بڑھائیں لیکن یہ بات وہ بھول گئے کہ خدا کی کروڑوں کی تعداد میں ایسی مخلوق بھی یہاں موجود ہے جس سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ان کی سماجی ناہمواری پر کچھ لوگوں کو خواہ احساس رہا ہو لیکن عملی طور پر یہ سب باتیں سیاسی حکمت عملی کے سائے میں دب کر رہ گئیں۔

زمانے نے پچھلے حاکموں کو کچھ مواقع دیے تھے جسے وہ نہیں نباہ سکے۔ تاہم اب زمانہ

ان ہی ناہموار لوگوں میں مساوات اور ہمواری پیدا کرنے کی طرف مائل ہے۔ اور یہی وہ شکل ہے جواب جنوبی ہند میں ہریجنوں کو اسلام سے قریب لا رہی ہے۔

پوری طرح یاد نہیں رہا لیکن اندازہ ہے کہ پانی پت میں مشہور غزنوی خاندان کے مولانا عبداللہ غزنوی رہتے تھے۔ ان کی مجلس میں ایک نومسلم ہریجن بھی آتا تھا اور بڑے ذوق وشوق سے کلام اللہ کی تشریح اور درس حدیث سنا کرتا تھا۔ اس زمانے میں مسجدوں میں نل نہیں ہوتے تھے ہر مسجد میں ایک کنواں ہوتا تھا اور سب لوگ اسی سے پانی بھر کر وضو کیا کرتے تھے۔ مولانا عبداللہ غزنوی مرحوم کو ایک بار یہ احساس ہوا کہ اس نومسلم بھائی کے کنویں سے پانی لینے پر شاید کچھ لوگ کبیدہ خاطر ہیں۔ مولانا اس کا احساس کر کے ایک دن درس سے فارغ ہو کر اپنے نومسلم بھائی سے کہا کہ وہ ایک ڈول میں پانی بھرے۔ اس کے بعد خود انھوں نے اس سے کہا کہ وہ خوب سیر ہو کر پانی پیئے پھر خود اس بقیہ پانی کو پیا۔ اس کے بعد باقی بچے ہوئے پانی کو لے کر یہ ڈول پھر ڈبو یا گیا اور دوسرے لوگوں نے اس پانی کو نوش جان کیا۔

یہ بات بہت معمولی سی تھی لیکن عوام کی نفسیات کو سدھارنے کے لیے یہ ایک عملی انداز فکر تھا۔ جس نے بہت سے بھائیوں کے لیے راستہ کھول دیا۔

ابھی ہم نے سنا ہے کہ تامل ناڈو میں کسی مدرسے کے استاد نے اپنے ہریجن شاگرد کے نکاح میں اپنی لڑکی دے دی۔ ویسے صاحب عقیدہ انسان سب برابر برابر ہیں۔ اس لیے یہ بات کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی کہ معاشرتی لحاظ سے جو لوگ یکسانیت رکھتے ہوں ان کا رشتہ جوڑ دیا جائے مگر عام طور سے یہ باتیں کچھ پیچھے کی سی رہ گئی ہیں۔ ویلور کے جن مسلم نے یہ راہ دکھائی ہے وہ بہت مبارک باد کے مستحق ہیں ویسے تو بستیوں کی بستیاں جب اسلامی ہدایت قبول کرلیں تو ان کے شادی بیاہ بھی آپس ہی میں ہوتے رہیں گے لیکن دوسروں میں بھی یہ گنجائش پانا ایک نئے جذبہ کو بڑھاوا دیتا ہے جس کی پوری طرح قدر کی جانی چاہیے۔ ویلور کے جن بزرگ نے یہ کام کیا ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ وہ ہم سب کے لیے اچھی مثال ہے اور اس کو قدر شناسی کے ساتھ دیکھنا چاہیے۔

(ہفت روزہ دعوت، دہلی، ۱۹ر جولائی ۱۹۸۱ء)